محروم و مظلوم طبقات

اور

مسلمان

محمد اقبال ملّا

محروم و مظلوم طبقات
اور
مسلمان

محمد اقبال مُلّا

مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۲۵

ترتیب

پیش لفظ	۵
۱– ابتدائی تعارف	۹
● محروم ومظلوم طبقات	۹
● دلت کی تعریف میں استعمال شدہ اصطلاحیں	۱۰
۲– تاریخی حیثیت	۱۳
● برہمن ● چھتری ● ویشیہ ● شودر	۱۴
۳– چند اہم حقائق	۱۸
● غلط پروپیگنڈا	۱۸
● محروم طبقے کی فکری لغزش	۲۰
۴– مظلوم طبقات میں روابط کی اہمیت	۲۳
● انبیاؑ اور مظلوم طبقات	۲۳
● اسلام مظلوموں کے حقوق کا علم بردار	۲۷
● فسادات کا ایک پہلو	۲۹
۵– اسلام اور محروم طبقات کے مفکرین	۳۱
● جیوتی باپُھلے	۳۱
● ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر	۳۲
● راماسوامی نائیکر	۳۶
● پتت پاون داس	۳۶
● تبصرہ	۳۷

۶ – ذاتوں کی کش مکش اور مسلمان **۳۹**
● ایک قابلِ توجہ پہلو ۴۱
● مشترکہ پروگرام ۴۵
● پیش رفت کی صورتیں ۴۶
۷ – محروم طبقات کی اہم شخصیات **۴۸**
(۱) جیوتی با پھلے ۴۸
(۲) ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر ۵۳
(۳) شاہو مہاراج ۵۹
(۴) راماسوامی نائیکر پیری یار ۶۳
(۵) کانشی رام ۶۷
۸ – عملی پروگرام **۷۲**
● لمحۂ فکریہ ۷۲
● اقدام کی ضرورت ۷۴
● گفتگو کے نکات ۷۶
● ایک خاکہ ۸۰
● تعلیمی امداد کا اہتمام ۸۰
● صحت اور صفائی ۸۰
● لائبریری کا قیام ۸۱
● دیگر ضروری سرگرمیاں ۸۱
● عیدملن کی مجالس ۸۱
● سیرتِ رسولؐ کے جلسے ۸۲
۹ – پونہ پیکٹ (تاریخی پس منظر) **۸۳**
کتابیات ۸۵

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

فریضۂ دعوت کی احسن طریقے سے ادائیگی کے لیے دعوتی نقطۂ نظر سے ملک کی مختلف آبادیوں اور طبقات کے احوال اور کوائف کا مطالعہ نہیں کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں بعض حلقوں کی طرف سے کوششیں کی گئی ہیں جو قابل قدر ہیں لیکن کافی نہیں ہیں۔ حالاں کہ یہ کام منصوبہ بند اور منظم انداز سے کیا جانا چاہیے تھا۔ مسلمانوں نے تعلیم، معیشت، سیاست، اصلاح معاشرہ اور خدمت خلق کے لیے مقامی سطح سے لے کر ریاستی اور ملک گیر سطح پر منصوبے بنانے اور تحریکات چلانے کا اہتمام تو کیا، لیکن افسوس کہ فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے لیے مذاہب کا مطالعہ کماحقہ نہ کر سکے۔ یہاں موجود مختلف تہذیبوں اور ان کے مذہبی تصورات کے بارے میں واقفیت حاصل نہیں کی۔ جدید رجحانات اور تحریکات کو جاننے کا اہتمام نہیں کیا، حالاں کہ دعوتی نقطۂ نظر سے اس کی سخت ضرورت تھی۔

ملک میں دلت کہلانے والے مظلوم و محروم طبقات کروڑوں کی تعداد میں موجود ہیں۔ ان کے مسائل کے حل کی کوششیں مختلف این جی اوز (NGOS)، فلاحی تنظیمیں اور حکومتیں کرتی ہیں، لیکن محدود فائدوں کے سوا کچھ حاصل نہیں ہو سکا۔ اصل مسائل جوں کے توں باقی ہیں، بلکہ ان کی سنگینی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ حکومت کی غلط پالیسیوں، استعمارانہ اسکیموں اور غریب مخالف فیصلوں کی وجہ سے صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ برسر اقتدار مختلف حکومتوں کی جانب سے انسانی حقوق کی پامالی کی تاریخ طویل ہے۔

اسلام، ظلم و ستم کی شکار آبادیوں، محروم طبقات اور کم زوروں کے حقوق کا علم بردار ہے۔

اس کی تعلیمات کی ٹھنڈی چھاؤں میں ان کے لیے امن وسکون موجود ہے اور قلب ونظر کی تسکین کا سامان ہے۔ پہلے بھی انھیں اسلام کے زیر سایہ بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ، عدل ومساوات اور محبت ومودت ملی تھی اور اب بھی اسلام کے سایہ میں یہ تمام نعمتیں مل سکتی ہیں۔

اس کتاب میں محروم ومظلوم طبقات کا ایک مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ایک ابتدائی کوشش ہے۔ مجھے امید ہے کہ اس موضوع پر دوسروں کو مزید کام کرنے کا حوصلہ ملے گا۔ اس سے قبل راقم کی ایک کتاب ''آدی باسی سماج اور مسلمان'' شائع ہوچکی ہے۔ امید ہے کہ ان کتابوں کے مطالعہ سے ملک کے مظلوم ومحروم طبقات کے احوال اور ان کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ ان آبادیوں میں کام کا منصوبہ بنانے کے لیے عملی پروگرام کے عنوان سے بعض اہم اور ضروری امور کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔

جماعت اسلامی ہند نے اپنی تشکیل (اپریل 1948) کے فوراً بعد فریضۂ دعوت کی ادائیگی کے لیے اپنے ارکان، وابستگان اور مسلمانوں کو متوجہ کیا تھا۔ اس کے بعد ہر چار سال کے لیے میقاتی پالیسی وپروگرام اور منصوبہ بنایا جاتا رہا۔ اس میں دعوت کو ہمیشہ شامل رکھا گیا۔ دعوتِ دین جماعت کی اولین ترجیحات میں شامل ہے۔ جماعت نے ملک کے تمام برادرانِ وطن کے اندر دعوتی کام کے ساتھ محروم ومظلوم طبقات اور آدی باسی آبادی میں کام کو خصوصی اہمیت دی ہے، لیکن اس سلسلے کے منصوبوں اور تقاضوں کی اب تک معیار مطلوب کی حد تک تکمیل نہیں ہوسکی ہے۔

اس کتاب کی تیاری میں جناب عبدالرب کریمی معاون شعبہ نے تعاون کیا۔ انھوں نے جناب ارشاد احمد خان کے ساتھ مل کر، مذہبی کتابوں کے حوالوں کی تصحیح کی۔ میں اس کے لیے ان دونوں حضرات کا مشکور وممنون ہوں۔ حسبِ سابق اس کتاب کی تیاری میں ڈاکٹر محمد رفعت چیئرمین تصنیفی اکیڈمی اور ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی سکریٹری تصنیفی اکیڈمی کی رہ نمائی اور مشورے شامل ہیں، میں ان کا بھی ممنون ومتشکر ہوں۔ جناب انتظار نعیم اسسٹنٹ سکریٹری شعبہ ملّی وملکی امور، جناب آر ایس عادل ایڈوکیٹ اور جناب نذر محمد مدعو، سابق امیر حلقہ جماعت اسلامی ہند، مہاراشٹر اور مولانا نسیم غازی فلاحی نے مسودہ دیکھ کر اپنی قیمتی رائیں دی ہیں اور مشوروں سے نوازا ہے۔ راقم تہہ دل سے ان حضرات کا متشکر ہے۔

اللہ تعالیٰ ان سب کو جزائے خیر سے نوازے، آمین۔ امید ہے کہ یہ کتاب وابستگان تحریک اور برادرانِ ملت میں دعوتی جذبے کو پروان چڑھانے میں ممد ومعاون ثابت ہوگی۔

جن کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کے مکمل حوالے اس کتاب کے آخر میں درج ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، اس میں کامیابی عطا فرمائے آمین۔

محمد اقبال مُلّا
سکریٹری شعبہ دعوت جماعت اسلامی ہند
mdiqbal.jih@gmail.com
Mob: 9810032508

نئی دہلی
۲۵ر نومبر ۲۰۱۷

ابتدائی تعارف

محروم ومظلوم طبقات

ہمارے ملک میں قدیم زمانے سے آج تک بعض مظلوم طبقات پائے جاتے ہیں۔ انہیں دلت کہتے ہیں، جنہیں پہلے اچھوت کہا جاتا تھا۔ ان مظلوم اور استحصال کا شکار آبادیوں میں آدی باسی بھی شامل ہیں۔

ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اتنی بڑی تعداد، جو ملک میں پائی جاتی ہے، کیسے وجود میں آئی؟ ان کی تاریخ کیا ہے؟ یہ لوگ کن مراحل سے گزر کر یہاں تک پہنچے ہیں۔ ان کے حالات اور مسائل کیا ہیں؟ یہ مظلوم اور پست ہیں اور ان کا استحصال ہوتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، اس کے اسباب اور وجوہ کیا ہیں؟ کچھ چالاک لوگ ان کو دوسروں کے خلاف استعمال کر کے ئی لڑاؤ اور حکومت کرونی کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کی روک تھام کیسے کی جاسکتی ہے؟ اس سلسلے میں اسلام کا کوئی رول ہے یا نہیں؟ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ میں واضح رہ نمائی موجود ہے۔ اگر مسلمان اس کے برخلاف عمل کرتے ہیں تو کیا ان مسائل کے حل کی کوئی امید کی جاسکتی ہے؟ اتنی بڑی آبادی کی اخروی نجات کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ ان سوالات پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلامی تعلیمات، بالخصوص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں جو رہ نمائی ملتی ہے، اس کی روشنی میں اپنی ذمہ داری سمجھنے اور موجودہ حالات میں اسے ادا کرنے کی فکر ہونی چاہیے۔

آج بھی محروم طبقے عزت نفس، خودداری، انسانی برابری، مساوات اور سماجی عدل سے محروم ہیں۔ یہ ماضی میں مظالم اور استحصال کا شکار تھے، آج بھی محفوظ نہیں ہیں۔

ماضی میں کئی بڑی شخصیات نے ان کے مسائل کو حل کرنے کی انتھک کوششیں کیں، تحریکیں چلائی گئیں، عوام کے اندر شعور پیدا کرنے اور حکومتوں کو متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی، بڑے بڑے پروگرام اور کانفرنسیں منعقد کی گئیں، نیز قراردادیں منظور کی گئیں، لٹریچر تیار کیا گیا، چھوٹے بڑے ادارے قائم ہوئے، اسمبلیوں اور پارلیمنٹ میں قوانین وضع کیے گئے، لیکن بنیادی مسائل آج بھی اپنی جگہ برقرار ہیں۔ البتہ ان کوششوں کے کچھ مادی فائدے محدود پیمانے پر ضرور ان آبادیوں کو حاصل ہوئے ہیں۔

یہ واقعہ ہے کہ اس طرح کی کوششوں سے ان طبقات کا بنیادی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ انہیں خودداری، عزت نفس، برابری اور سماجی انصاف حاصل ہو اور انہیں انسان سمجھا جائے، اس مسئلے کا حل صرف اسلام ہے۔ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس آبادی سے بے تعلق نہ رہیں، ان کے مسائل میں دل چسپی لیں اور انھیں حل کرنے کے لیے اسلام کی تعلیمات اور حضرت محمدؐ کی سیرت سے رہ نمائی حاصل کریں۔ منظم طور سے آگے بڑھیں تو ان شاء اللہ بہ تدریج مسائل حل ہوں گے۔ ہمارا دعوتی فریضہ ہے کہ اس آبادی کے سلسلے میں ہم اپنی ذمہ داریوں کو سمجھ کر ادا کریں۔

دلت کی تعریف میں استعمال شدہ اصطلاحیں

ماضی بعید میں دلت کہلانے والوں کے لیے نامناسب الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے۔ ان ناموں میں حقارت اور نفرت و دشمنی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ آزادی سے قبل ہریجن کا لفظ استعمال کیا گیا۔ گاندھی جی نے اپنے رسالے 'ہریجن' میں اس کے استعمال کو عام کرنے کی کوشش کی، لیکن دلت کہلانے والے اس کو اپنے لیے گالی سمجھتے ہیں، اس لیے اس کا استعمال عام نہیں ہوسکا۔ اسی طرح شودر اور اچھوت کا استعمال بھی نامناسب ہے۔ اب دلت کی اصطلاح رائج ہوگئی ہے۔

دلت دانش ور خود کو ہندو کہلانا سخت ناپسند کرتے ہیں، کیوں کہ بہ قول ان کے وہ ہندو نہیں ہیں۔

پروفیسر عبدالمغنی اپنے مضمون 'دلتوں کی آزادی کے لیے اسلام کا فرمان' میں لکھتے ہیں:

'دلت' کا مطلب ہے کچلا ہوا، یعنی مظلوم اور پس ماندہ۔ ہندوستان میں اس کا مطلب ہے سماج سے نکالا ہوا اچھوت۔ یہ لفظ قدیم ہندو معاشرتی نظام میں ورن (کاسٹ/ذات) کے تصور سے ماخوذ ہے، جو ہندوستان میں طویل مدت سے آج تک رائج ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کی عقلی توجیہ ایک پیشہ ور طبقے کی حیثیت سے کی ہے، لیکن درحقیقت یہ سراسر ایک نسلی تصور ہے۔ اس کے پس منظر میں ایک مابعدالطبیعی تخیل ہے، جس کو آواگمن کہا جاتا ہے۔ سمجھا جاتا ہے کہ مرد اور عورت (موت کے بعد) مختلف صورتوں میں، یہاں تک کہ جانوروں کی شکلوں میں بھی اپنے کرم (اعمال) کا نتیجہ بھگتنے کے لیے بار بار جنم لیتے ہیں، تاکہ بالآخر نجات حاصل کرسکیں۔ اس طرح ایک قسم کی تقدیر پرستی دھرم بن گئی ہے، جس پر بہتیرے ہندو مفکروں نے فلسفہ طرازیاں کی ہیں۔''

(دلت دکھ درد اور اسلام صفحہ :72)

پروفیسر محمد بشیر اپنے مضمون 'دلتوں کی بہبود کے لیے تحفظات' میں تحریر فرماتے ہیں:

''دلت لفظ کے معنی دبے کچلے، ٹوٹے بکھرے، پس ماندہ اور حقیر کے ہیں۔ دلت کا ایک اور مفہوم ہے: اچھوت اور دبا کچلا طبقہ، ہریجن، شیڈولڈ کاسٹ اور شیڈ ولڈ ٹرائب اور دیگر پس ماندہ قومیں۔ لفظ دلت کا اطلاق ان پست ذاتوں پر بھی ہوتا ہے جن پر اچھوت ہونے کا داغ لگا ہوا ہے۔

جبر اور شکستگی کا جو تجربہ دلتوں کو ہوتا رہا ہے، یہ بدقسمتی سے ان پر موروثی طور پر پیدائش ہی سے عائد کردیا گیا ہے۔ (ہندو) مذہب نے دلتوں کو پس ماندہ اور شکستہ حال بنانے میں مرکزی کردار ادا کیا ہے۔ ہندو مذہبی کتب میں واضح طور پر انسانوں کی درجہ بندی نسلی اعتبار سے کی گئی ہے اور اس درجہ بندی میں

دلتوں کو پست ترین مقام دیا گیا ہے۔اس کے نتیجے میں دلت انتہائی افلاس کی حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔زندگی ان کے لیے نہ ختم ہونے والی اذیت اور مشقت کا نام ہے، جو انہیں انسانی یا خدائی ہم دردی سے محروم ہو کر گزارنی پڑتی ہے۔''(دلت دکھ درد اور اسلام،صفحہ 33:)

☆☆☆☆

تاریخی حیثیت

یہ مظلوم اور استحصال کے شکار طبقات کیسے وجود میں آئے ہیں؟ تاریخ ہند میں اس کا جواب ملتا ہے۔

تاریخی اعتبار سے بھارت میں تقریباً 4 ہزار سال قبل آریہ قوم وسط ایشیا سے نکل کر شمالی ہند میں آئی اور پہلے سے موجود اقوام سے اس کا سامنا ہوا۔ آریاؤں نے اپنی آمد کے بعد مقامی باشندوں کے ساتھ جنگیں کیں۔ آریہ مختلف علوم وفنون میں آگے تھے۔ جنگی آلات اور ہتھیاروں کی صنعت میں ترقی یافتہ تھے، اس لیے ان کی فتح ہوئی۔ آریاؤں نے فتح حاصل کر کے مکمل قبضہ کرلیا اور مفتوح قوم کے ساتھ بدترین سلوک روا رکھا۔ بہت سے بہادر ایسے تھے جنھوں نے شکست کے بعد آریاؤں کی ماتحتی، غلامی اور اقتدار کو قبول نہ کر کے اپنی آزادی کو ترجیح دی۔ اس کے نتیجے میں ان کو آبادیاں چھوڑ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں چھپ کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ ان کو آدی باسی کہا جاتا ہے۔ وہ ملک کی 26 ریاستوں اور مرکز کے ماتحت علاقوں (Union Territories) میں بستے ہیں۔ ایک تعداد ایسی بھی تھی جنھوں نے حملہ آوروں سے مقابلہ کیا، شکست کھانے کے بعد خود سپردگی کی۔ انھیں غلام بنالیا گیا اور ان کا استحصال کیا گیا۔ ذات پات (ورن ویوستھا) کا ایک ظالمانہ نظام ترتیب دیا گیا۔ اس کے لیے نام نہاد مذہبی بنیادیں فراہم کی گئیں۔ یعنی پیدائش کی بنیاد پر کچھ لوگوں کو افضل بتایا گیا اور کچھ کو پست وذلیل قرار دیا گیا۔ ان کی ذمہ داری یا فرض یہ بتایا گیا کہ اوپر کے افضل اور اعلیٰ لوگوں کی خدمت کرتے رہیں۔ ان کا کوئی حق نہیں تھا، صرف فرائض ہی انھیں

ادا کرنے تھے۔ انسانوں کی پیدائش کی بنیاد پر چار ذاتوں میں تقسیم کر کے اور ظالمانہ نظام بنا کر سب سے نچلی ذات کو جکڑ دیا گیا۔

چار الگ الگ ذاتیں درج ذیل ہیں۔

(۱) برہمن

یہ سب سے اوپر ہیں ان کو زمین کا دیوتا (بھودیو) کہا گیا۔ وید اور مذہبی کتب کی تعلیم حاصل کرنا، حفاظت کرنا اور مذہبی امور کو اپنی نگرانی میں انجام دینا ان کا فرض قرار دیا گیا۔

(۲) چھتری (کشتری)

یہ دوسرا درجہ ہے۔ ان کے ذمہ دفاع، ملک کی حفاظت اور سماج میں امن وامان قائم رکھنا ہے۔

(۳) ویشیہ

یہ تیسرا درجہ ہے۔ ان کا کام یہ ہے کہ تجارت اور زراعت کے ذریعہ مال ودولت میں اضافہ کریں۔

(۴) شودر

یہ سب سے نیچے کا درجہ ہے۔ مذکورہ تینوں ذاتوں کی خدمت دل وجان سے کرتے رہنا ان کا فرض، بلکہ اصلی دھرم ہے۔ ان کے لیے کوئی حق نہیں ہے۔

آریاؤں کی بھارت میں آمد کی تاریخ 4 ہزار سال پرانی ہے۔ اس سلسلے میں مورخین کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے کہ آریہ باہر سے آئے تھے یا اسی ملک کے باشندے تھے۔ یہاں آریاؤں کی آمد سے متعلق ایک اہم تحریر پیش کی جاتی ہے۔ جناب شفیق ہاشمی اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں:

> ’’حالات اور واقعات کا تاریخی پہلو سے جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اغلباً یہ قوم (آریہ) سام بن نوحؑ کی نسل سے ہے۔ تقریباً ساڑھے تین ہزار برس قبل یہ لوگ ایشیائے کوچک میں واقع سلسلۂ کوہ ارارات کے دامن میں آباد تھے، جس کی سب سے اونچی چوٹی ’جودی‘ پر کشتیِ نوحؑ آ کر ٹھہری تھی۔

آریہ بنیادی طور پر دشت نورد یا خانہ بدوش تھے۔ اپنے مال مویشی کے لیے چراگاہیں کم پڑ جاتیں یا غذا اور پانی کا مسئلہ ہوتا تو پڑوسی علاقوں کی طرف نکل جاتے۔ اس طرح صدیوں پہلے اس کی ایک شاخ مغربی یورپ میں جرمن کی جانب کوچ کر گئی، بعد میں جس سے انڈو جرمینگ نسل چلی۔ اسی دوران یا اس کے بعد ان کا دوسرا بڑا جتھا نقل مکانی کرتا ہوا مشرقی سمت چل پڑا۔ تعداد میں زیادہ ہونے کی بنا پر یہ لوگ جہاں جاتے وہاں کے وسائل اور اقوام کو تہس نہس کرتے اور جب تک پانی، غذا اور چارے کی فراوانی رہتی، اسے بے دریغ استعمال میں لاتے اور جب یہ وسائل کم پڑنے لگتے تو بچی کھچی ثروت کا نگراں بنا کر اپنی نسل کا ایک حصہ وہاں چھوڑتے ہوئے آگے بڑھتے۔ اس نسل کے جو لوگ پیچھے رہ جاتے وہ قدرتی طور پر وہیں کی بود و باش اختیار کر لیتے لیکن بجائے مغلوب اقوام میں ضم ہونے یا انہیں خود ہی ضم کرنے کے انہیں اپنا باج گزار اور محکوم بنا کر رکھتے، تا آں کہ وہ یا تو ان کا ایک پس ماندہ طبقہ بن کر زندگی کاٹنے پر مجبور ہو جاتے یا پھر دست برد زمانہ کی نذر ہو جاتے۔

گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتا آریاؤں کا یہ ٹڈی دل تقریباً 3 صدی قبل مسیح سے دو صدی قبل مسیح کے دوران ایران، خراسان اور سجستان (موجودہ افغانستان) کو تہ و بالا کرتا وادیِ سندھ میں داخل ہوا۔ آریوں کی مسلسل آمد کا یہ دورانیہ اس بات کا گواہ ہے کہ کسی سرزمین کو اس عرصے میں اپنی سرزمین سمجھ کر یہ کہیں ٹک کر نہیں رہے، تا آں کہ وادیِ گنگ و جمن ان کا مستقل ٹھکانا بنا۔ دوآبۂ گنگ و جمن کے برعکس وادی سندھ ہزاروں سال پرانی تہذیب و تمدن کا گہوارہ تھی۔ آریہ یلغار کے بعد وہی تہذیب موہن جوداڑو اور ہڑپہ کے کھنڈروں میں تبدیل ہو گئی۔'' (فرائیڈے اسپیشل، 23 مارچ 2012ء، صفحہ 13، مضمون آریائی تہذیب)

بعض لوگوں نے یہ مغالطہ دینے کی کوشش کی ہے کہ چار ذاتوں میں سماج کی تقسیم پیدائش کی بنیاد پر نہیں ہے، دراصل سماج کے اندر مختلف پیشے اختیار کرنے کی وجہ سے اس طرح کے طبقات بہ تدریج اور فطری طور پر وجود میں آ گئے۔ لٰہذا سماج میں جس طبقے

کے ذمے جو کام اور فرائض سونپے گئے تھے ان کو وہی کام کرتے رہنا چاہیے اسی کے نتیجے میں سماج قائم رہ سکتا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ ایک مغالطہ ہے۔ اگر یہ تقسیم پیشوں کی بنیاد پر تھی اور ہے تو آخری درجے کے لوگوں کو اپنے پیشوں کو چھوڑنے اور دوسرے پیشوں کو اختیار کرنے کی اس زمانے میں نہ اجازت تھی، نہ کوئی موقع ہی حاصل تھا۔ اس کے ساتھ اس تلخ حقیقت کو بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ نچلے درجے والے کبھی اوپر نہیں آسکتے تھے، خواہ وہ کتنے ہی باصلاحیت اور اعلیٰ اخلاق کے حامل ہوں۔ یہ عجیب وغریب تقسیم تھی کہ نچلے درجے والوں کے صرف فرائض ہی فرائض تھے اور انہیں کوئی حق حاصل نہیں تھا اور ان کا اصل دھرم یہ بتایا گیا تھا کہ وہ اوپر کے تینوں درجوں کی خدمت بلا چوں وچرا کرتے رہیں۔

آج جدید تعلیم، دستوری تحفظات اور قوانین، سرکاری سہولتوں ومراعات اور ریزرویشن کی وجہ سے حالات میں تبدیلیاں آئی ہیں۔ محرومین کے اندر سیاسی وغیر سیاسی جماعتیں، تنظیمیں، ادارے اور شخصیتیں سرگرم عمل ہیں۔ مختلف تحریکات بھی اپنا رول ادا کر رہی ہیں، لیکن ان سب کے باوجود ان کا اصل مسئلہ، جو بنیادی اور سب مسائل سے بڑھ کر اہم ہے، حل نہیں ہوا ہے، یعنی عزت نفس، خودداری اور مساوات کا حصول۔

ذات پات کے نظام کے متعلق لالہ لاجپت رائے کی بعض تحریریں ذیل میں پیش کی جاتی ہیں جن سے اس مسئلہ کی سنگینی کا کچھ اندازہ ہوگا۔ یہ باہر کے کسی کی شہادت نہیں ہے، بلکہ گھر کے ایک فرد کی شہادت ہے۔

لالہ لاجپت رائے تحریر فرماتے ہیں:

> ”ذات پات کا نظام ہندوؤں کے لیے ایک لعنت بھی رہا ہے اور ایک نعمت بھی۔ ایک طرف اگر یہ نظام ہندوؤں کی سماجی اور سیاسی گراوٹ کا بڑا سبب بنا تو دوسری جانب ایک سماجی اور قومی تنظیم کے اعتبار سے ہندوؤں کو مکمل انتشار اور تباہی سے بچانے کا باعث بھی یہی نظام تھا۔ گزشتہ دوہزار برس سے ذات پات کا نظام ہندودھرم کے لیے کم وبیش ایک دفاعی قلعے کا کام دیتا رہا ہے۔“ (آریہ سماج کی تاریخ صفحہ 145)

لاجپت رائے اپنے ہم مذہبوں کو سمجھاتے ہیں:

”یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قومی پیشے کی بنیادی وجہ دوسروں پر جبر وظلم ہے۔ اگر ہم ہندوستانی قومی وقار اور خود داری حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیے کہ پس ماندہ طبقے کے اپنے بدنصیب بھائیوں اور بہنوں کو گلے لگانے کے لیے بانہیں کھول دیں اور انہیں انسانی وقار کے اہم جذبے کو ابھارنے میں مدد دیں۔ جب تک اس ملک میں اچھوتوں کے بہت بڑے طبقے موجود ہیں ہم قومی امور میں کوئی حقیقی ترقی نہیں کر سکتے۔ اس قسم کی ترقی کے لیے ایک بہت بڑے اونچے اخلاقی معیار کی ضرورت ہے، جہاں کم زور طبقات کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہو وہاں ایسے معیاروں کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔“ (ایضاً،صفحہ 156)

انھی کا ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

”میرا پختہ عقیدہ ہے کہ اپنے ہم جنسوں کے ساتھ بے انصافی برتنا، ان پر ظلم کرنا، انسانوں کی جائز امنگوں کا گلا گھوٹنے کی کوشش کرنا اور دوسروں کی مصیبت سے فائدہ اٹھانے کے لیے انہیں دبائے رکھنا ایسے مظالم ہیں جنہیں روا رکھنے والے خود کو ان کے اثرات سے بچا نہیں سکتے۔ جلد یا دیر انہیں بھی اس قسم کے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان کے بچاؤ کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ وہ اپنے گناہوں کی شدت کا احساس کرتے ہوئے ان کا کفارہ ادا کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔“ (ایضاً،صفحہ:157)

پچھلے صفحات میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ذات پات کا نظام محض سماج میں افراد کے پیشوں کی بنیاد پر وجود میں نہیں آیا، بلکہ اس کے لیے انسانوں کی پیدائش کو ذمے دار قرار دیا گیا ہے۔ اور ہندو مذہب میں اس کی بنیادیں موجود ہیں۔ جناب انتظار نعیم لکھتے ہیں:

”ویدوں کا ہندوؤں کی قدیم ترین مذہبی کتب میں شمار ہوتا ہے۔ رگ وید کے پرش سوکت میں جو منتر پائے جاتے ہیں انہیں ورن (ذات پات کے نظام) کی مستحکم اور پرشکوہ بنیاد تصور کیا جاتا ہے۔“ (دلت دکھ درد اور اسلام، صفحہ:10)

☆☆☆

چند اہم حقائق

محروم اور مظلوم طبقات کی مختصر لیکن دردناک تاریخ پچھلے صفحات میں آپ مطالعہ کر چکے ہیں۔ تاریخی حقائق کو نظر انداز کرنا، غلط نتائج اخذ کرنا اور اس کی بنیاد پر مستقبل کے نقشے بنانا قوموں کے لیے تباہ کن ہے۔ اس نامبارک کوشش کی باوجود تاریخ کو مسخ تو کیا جاسکتا ہے لیکن بدل دینا ممکن نہیں ہے۔ ایسی کوششوں کا نتیجہ نئی نسلوں کے بھٹک جانے اور انسان کی عظمت واحترام سے بیگانہ ہو کر ظلم وستم جنگ وجدال برپا کرنے کے سوا کیا ہوسکتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ تاریخی حقاق کا بے لاگ مطالعہ، تجزیہ اور صحیح نتائج اخذ کر کے مستقبل کی تعمیر کے نقشے، احترام اور عظمت انسان، مساوات اور حریت فکر وعمل کی بنیاد پر بنائے جائیں۔

افسوس ہے کہ ہمارے ملک میں ماضی میں اور آج بھی بعض عناصر کی مسلسل کوشش یہی ہے کہ تاریخ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا جائے۔ نفرت ودشمنی، فرقہ پرستی اور تہذیبی جارحیت جیسے مذموم مقاصد کے لیے تاریخ کا استعمال کیا جائے۔ یہ نہایت ہی افسوسناک صورتحال ہے۔ اہل ملک کو ان حقائق سے باخبر ہو کر ان کوششوں کو ناکام بنانا چاہیے۔ کیوں کہ فرقہ پرستوں کی کوشش کامیاب ہوجائے تو ملک اور اہل ملک کا بہت نقصان ہوگا۔

غلط پروپیگنڈا

بعض تنظیموں کے ذریعہ ایک عجیب غلط فہمی پھیلائی جارہی ہے۔ اس کی حقیقت کو

سمجھ لینا چاہیے، تاکہ بھولے بھالے افراد کو سمجھایا جاسکے اور وہ اس کا شکار نہ ہوں۔ ان تنظیموں کا کہنا ہے کہ دلت اور مظلوم وپس ماندہ آبادیوں اور آدی باسیوں کی موجودہ حالت زار کے ذمہ دار مسلمان ہیں۔ یہ سب ماضی بعید میں ہندو تھے۔ دیگر ہندوؤں کی طرح اچھی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے، سکون وراحت کی زندگی گزارتے تھے۔ لیکن مسلمان بادشاہوں نے اپنے دورِ حکومت میں ان طبقات پر مظالم ڈھائے، جس کے نتیجے میں ان کے حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

یہ ایک حیرت انگیز جھوٹ ہے۔ جھوٹ بولنے کی کوئی حد تو ہونی چاہیے۔ مسلمانوں کی تاریخ اس ملک میں 712ء سے شروع ہوتی ہے، جب کہ دلتوں پر ظلم وستم، ان کا استحصال اور چھوا چھات کا سلسلہ 4 ہزار سالہ پرانا ہے۔ اس ملک میں مسلمانوں کی آمد سے ہزاروں سال قبل سے یہ سلسلہ جاری ہے، جس کے تاریخی شواہد حوالوں کے ساتھ کتابوں میں موجود ہیں۔

ایک اور پہلو قابل غور ہے۔ کیا ان مذہبی کتابوں کو مسلمانوں نے لکھا ہے؟ جن زمانوں میں الگ الگ موقعوں پر یہ کتب لکھی گئی تھیں، کیا اس وقت مسلمان اس ملک میں پائے جاتے تھے؟ کیا مسلمانوں کی ایسی پوزیشن تھی یا ہے کہ وہ اپنے علاوہ دیگر بھائیوں کے لیے مذہبی کتابیں تیار کرسکیں اور وہ مقبول عام بھی ہوں۔ ذات پات کے نظام کی بنیادیں، تعلیمات اور احکام، مذہبی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس دور میں مسلمان اس ملک میں نہیں تھے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم حکمرانوں نے رواداری اور عدم مداخلت کے جذبہ کے تحت سماج کی ذات پات کے مسئلہ کو داخلی مسئلہ سمجھا اور ملکی سماج کے ذات پات کے نظام سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ انہوں نے دخل اندازی کو مناسب نہیں سمجھا اور مظلوموں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ البتہ اولیائے کرام اور صوفیائے کرام نے ان آبادیوں پر توجہ دی، ان سے تعلق قائم کیا، انھیں گلے لگایا اور ان کی خدمت کی۔ اسلامی مساوات، عدل وانصاف اور حسنِ سلوک کے نتیجے میں اچھی خاصی تعداد میں لوگوں نے اسلام قبول کیا، اس طرح وہ ذلت سے محفوظ ہو گئے۔

محروم طبقے کی فکری لغزش

پچھلے صفحات میں تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک میں قدیم زمانے سے لے کر آج تک مظلوم ومحروم طبقات کے ساتھ کتنا ظلم وستم روا رکھا گیا۔ ان کی مظلومیت، بے بسی اور استحصال کا خاتمہ نہیں ہوا، البتہ حالات کچھ ضرور بدلے ہیں۔ انہیں ریزرویشن ملا اور سرکاری مراعات اور سہولتیں دی گئیں۔ تعلیم عام ہوئی تو معاشی حالات میں سدھار آیا۔ دستور ہند میں کئی تحفظات فراہم کیے گئے، پارلیمنٹ میں قوانین بنائے گئے۔ ان کی فلاح وبہبود کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتوں نے اسکیمیں جاری کیں۔ مرکزی حکومت نے شیڈول کاسٹ کمیشن بنایا۔ لیکن اصل مسئلہ (خودی، عزت نفس، مساوات اور سماجی انصاف کا حصول) اپنی جگہ برقرار رہا۔

ایک اہم حقیقت کی طرف ان عناصر کی توجہ نہیں ہے ۔ وہ اخروی زندگی میں نجات کا حصول اور جہنم کی آگ سے چھٹکارا پانا ہے۔ آج اس دنیا کی زندگی میں آخرت اور جنت ودوزخ کو آنکھوں سے دیکھا نہیں جاسکتا۔ یہ سب نظروں سے اوجھل ہیں۔ محض اس بنا پر آخرت کی زندگی کا انکار کرنا بہت بڑی نادانی ہوگی۔ آخر جنت اور دوزخ کو اپنی آنکھوں سے موت کے بعد دیکھ کر کون انکار کرسکتا ہے؟ سارا امتحان تو اسی بات کا ہے کہ آنکھوں سے دیکھے بغیر محکم عقلی دلائل پر غور کر کے خدا کی صفتِ رحمت اور صفتِ عدل کے تقاضے کے طور پر آخرت کے وقوع کو قبول کیا جائے۔ یہ صرف سادہ طرز کا ایک عقیدہ نہیں ہے، بلکہ اس کے قبول یا انکار کے گہرے اثرات پوری زندگی پر پڑتے ہیں۔ دنیوی کام یابی، مادی فلاح اور خوش حالی کے سلسلے میں متوازن تصور اور اخروی نجات کا تعلق عقیدۂ آخرت کو تسلیم کرنے سے ہے۔

ایک خیال یہ ہے کہ مسلمانوں کی زندگی بھی مسائل سے دوچار ہے۔ وہ بابری مسجد کو نہیں بچا سکے، کسی دوسرے گروہ کو مسلمانوں سے کیا فائدہ حاصل ہوگا؟ ان بھائیوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالی نے اس دنیا کی زندگی کو آخرت کی ہمیشہ کی زندگی سے قبل کا عارضی پڑاؤ بنایا ہے۔ دنیا کی زندگی ایک امتحان ہے۔ زندگی خواہ کسی کی بھی ہو، وہ

مسائل مشکلات اورخوشی اورغم کی کیفیات سے بھری ہوئی ہے۔ البتہ یہاں کی ہر کیفیت عارضی، ہنگامی اور وقتی نوعیت کی ہے، مستقل نہیں۔ یہاں کی خوشی بھی عارضی ہے اورغم ورنج بھی عارضی اور چندروزہ ہے۔ یہاں زندگی ہے تو موت بھی ہے۔ یہاں جوانی ہے تو بڑھاپا بھی ہے۔ یہاں دکھ درد ہے تو سکون وراحت بھی ہے۔ یہاں کام یابی ہے تو ناکامی بھی ہے۔ صحت ہے تو بیماری بھی ہے۔ دھوپ ہے تو چھاؤں بھی ہے۔ عدل وانصاف ہے تو ظلم وزیادتی اور بے انصافی بھی ہے۔ وہ کون سی جگہ ہے جہاں انسان تمام دکھ غم اور رنج سے نجات پا کر ہمیشہ کے لیے خوشی ومسرت اور راحت وسکون پاسکتا ہے؟ انسان فطری طور پر ایک ایسی زندگی کا خواہش مند ہے۔ وہ جگہ جنت ہے۔ اس لیے اپنی زندگیوں میں مسائل ومشکلات اوررنج وغم اور پریشانیوں کے ہجوم میں بھی مسلمان مایوس نہیں ہوتے۔ وہ خودکشی کو حرام سمجھتے ہیں۔ اللہ پر ایمان وتوکل کے سہارے بڑے بڑے حادثات کو برداشت کر لیتے ہیں۔ آخرت پر ان کی نظریں جمی رہتی ہیں۔ ان کا یقین ہوتا ہے کہ اصل قدر وقیمت تو صحیح عقیدہ اور صحیح اعمال کی ہے۔ انھیں اللہ کی رضا وخوش نودی کے لیے اعمالِ صالحہ کو اختیار کرنا چاہیے۔ دنیا کی زندگی میں قربانی، جدوجہد اور ثابت قدمی کا بدلہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور جنت کی ابدی نعمتوں کی شکل میں ملے گا۔ اس لیے مسلمان ہمیشہ پرامید ہوتے ہیں اور اللہ کی رحمت سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ دنیا کی چندروزہ زندگی کی محرومیاں، غم اور دکھ، درد سب ختم ہونے والے ہیں اللہ تعالیٰ کے حکم سے جنت میں ہمیشہ کے لیے خوشیاں، کام یابیاں اور راحت ملے گی۔ انسان کا سب سے بڑا مسئلہ اخروی زندگی میں جہنم کے عذاب سے نجات پانا ہے۔

دنیوی زندگی میں مسائل، مصیبتوں اور پریشانیوں کے باوجود مسلم فرد اور مسلم امت کے اندر ایمان ویقین کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ پرامید، مطمئن اور پرسکون ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک میں آزادی کے بعد سے اب تک ہزاروں فسادات ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی جان ومال عزت وآبرو پر حملے کیے گئے۔ قتل، لوٹ مار، عصمت دری کے واقعات پیش آئے اور بے گناہوں کو قید وبند کی تکالیف سے گزارا گیا، لیکن مسلمان اپنی جگہ جمے رہے۔ ایمان اور عقیدے کی وجہ سے وہ سخت حالات سے دوچار کیے گئے لیکن انہیں کبھی خیال بھی نہیں

گزرا کہ اس ایمان اور عقیدے کو چھوڑ دیں۔ ظاہر ہے یہ کیفیت اللہ پر پختہ ایمان اور آخرت کی زندگی پر گہرے یقین کے بغیر پیدا نہیں ہوسکتی۔

بابری مسجد شہید کیے جانے کا تذکرہ آچکا ہے۔ بابری مسجد کے مطالبے سے مسلمان دست بردار نہیں ہو گئے ہیں۔ کیس عدالت عظمٰی میں ہے۔ انہیں عدالت سے انصاف ملنے کی پوری توقع ہے۔ بابری مسجد کے معاملے میں پورے ملک کے اندر بے شمار انصاف پسند غیر مسلم بھائیوں کا تعاون اور تائید انہیں حاصل ہے۔ اس طرح فسادات کے بعد ملک میں عدم رواداری کا ماحول رہا لیکن کتنے ہی غیر مسلم دانش وروں، ادیبوں، شاعروں، سائنسدانوں، آرٹسٹوں، صحافیوں اور سیاستدانوں نے زبردست احتجاج کیا کہ حکومت بوکھلا گئی۔ اس احتجاج کی تشہیر بھی ہوئی۔

ان حقائق کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ ان کو نظر انداز کر کے یہ سمجھنا اور کہنا درست نہیں ہے کہ اسلام سے مسلمانوں کو فائدہ نہیں پہنچا تو دوسروں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ واقعہ کے اعتبار سے مسلمانوں کو عزت نفس، خودی اور مساوات کی نعمتیں تو حاصل ہیں۔

حقائق کو حکمت اور سلیقہ، پیار و محبت کے ساتھ اور مرعوب ہوئے بغیر مظلوم اور پس ماندہ آبادیوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے۔ آخرت کی زندگی یقینی ہے۔ اس سلسلے میں مختصر دلائل بھی ان کے سامنے رکھنا چاہیے، تاکہ وہ غور وفکر کرسکیں۔

محروم اور مظلوم طبقات کی تاریخی حیثیت اور مزید تفصیل جاننے کے لیے درج ذیل کتاب کا مطالعہ مفید ہوگا۔

نام کتاب : قدیم ہندوستان میں شودر، مصنف: ڈاکٹر رام سرن شرما، مترجم: جمال عمر صدیقی، پبلشرز اور پتہ: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ، نئی دہلی: دوسرا ایڈیشن: 1999ء

☆☆☆

مظلوم طبقات میں روابط کی اہمیت

آج دنیا میں صرف مسلمان ہی وہ گروہ ہیں جس کے پاس توحید کی قیمتی نعمت اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ خدا کو ماننے والی مختلف قومیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، مگران کا تصور الٰہ عموماً شرک سے آلودہ ہے، کہیں بھی خالص شکل میں نہیں پایا جاتا۔ توحید خالص کا فہم، انفرادی واجتماعی زندگی میں اس کے تقاضوں کا استحضار نیز توحید کی بنیاد پر مکمل نظام زندگی سے واقفیت قیمتی نعمت ہے۔ انبیاء کرامؑ کی دعوت توحید میں شرک سے مکمل اجتناب لازماً شامل رہا ہے۔

انبیا علیہم السلام اور مظلوم طبقات

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت اور رہ نمائی کے لیے اور انہیں گم راہی سے بچانے کے لیے دنیا کے مختلف ملکوں اور قوموں میں رسولوں اور انبیاء کو بھیجا۔ ان مقدس اور پاکیزہ ہستیوں نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رہ نمائی کو ٹھیک ٹھیک بندوں تک پہنچا دیا اور اپنی عملی زندگیوں سے اللہ تعالیٰ کی ہدایت اور رہ نمائی کا مکمل نمونہ بھی پیش فرمایا۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ ۚ فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ (یونس:۴۷)

''ہر امت کے لیے ایک رسول ہے۔ پھر جب کسی امت کے پاس اس کا

رسول آجاتا ہے تو اس کا فیصلہ پورے انصاف کے ساتھ چکا دیا جاتا ہے اور اس پر ذرہ برابر ظلم نہیں کیا جاتا۔‘‘

وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ ۝ (الرعد:۷)

’’ہر قوم کے لیے ایک رہ نما ہے۔‘‘

وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ (النحل:۳۶)

’’ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیج دیا اور اس کے ذریعہ سے سب کو خبردار کر دیا کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت کی بندگی سے بچو۔‘‘

تمام رسولوں اور انبیاء کی دعوت کے بنیادی نکات توحید، رسالت اور آخرت ہوا کرتے تھے۔ سب اسلام کے داعی تھے۔ اسی لیے تمام رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ایک کا انکار سب کا انکار ہے۔ ان کی دعوتی جدوجہد اور قوموں کے ردعمل کا مستند ریکارڈ قرآن مجید میں ہے۔ رسولوں کی دعوت اگرچہ عام تھی، لیکن ہر قوم کے بااثر عناصر اور سرداروں کو بالخصوص دعوت دی جاتی تھی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر وبیشتر دعوت کو پہلے مرحلے میں کم زور، مظلوم اور بہ ظاہر پست طبقات قبول کرتے تھے۔ ہر قوم کے بااثر اور صاحب اقتدار افراد بالعموم دعوت کا انکار ہی نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کی مخالفت کے لیے کمر بستہ ہو جاتے تھے۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم کے سامنے دعوت حق پیش فرمائی۔ ان کی قوم کے بااثر لوگوں نے جواب دیا:

اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ (الاعراف:۶۰)

’’ہم کو تو یہ نظر آتا ہے کہ تم صریح گمراہی میں مبتلا ہو۔‘‘

حضرت نوحؑ نے 950 برس تک اس قوم کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی، لیکن قوم کے بڑے سرداروں نے ہمیشہ جھٹلایا اور مخالفت کا رویہ اختیار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم کی عام اکثریت (عوام) نے دعوت کا انکار کر دیا۔ قوم کے سرداروں نے دعوت کی مخالفت کرتے

ہوئے جو اعتراضات کیے، ان میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ حضرت نوحؑ پر ایمان لانے والے زیادہ تر پس ماندہ اور کم زور ہیں۔ یہ ان کے نزدیک رُذیل نی لوگ تھے۔ قرآن نے اس کو یوں نقل کیا ہے:

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ (الشعراء:۱۱۱)

''وہ بولے: کیا ہم تم پر ایمان لائیں، تمہارے پیرو تو رذیل لوگ ہیں۔''

یعنی حضرت نوحؑ کے پیرو کوئی سماجی رتبہ رکھنے والے ذی اثر لوگ نہیں تھے، بلکہ مادی وسائل کے اعتبار سے بھی کم زور تھے۔ منکرین دعوت مال و دولت اور جاہ وحشمت والے تھے، اسی لیے وہ حضرت نوحؑ کے پیرووں کو رذیل کہتے تھے۔

دیگر انبیاء کے تعلق سے بھی یہی صورت حال پیش آئی، یعنی ان کے مخاطبین میں کم زور، پس ماندہ اور مظلوم لوگ ایمان لائے اور بااثر اور قوم کے سرداروں نے انبیاء کو جھٹلایا، مخالفت کی اور جان تک لینے کی کوشش کی۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں بھی یہی ہوا۔ قریشی سردار کہتے تھے کہ آپؐ ان غلاموں، کم زوروں اور غریبوں کو اپنے پاس سے ہٹائیں تو وہ آپؐ کی دعوت پر غور کریں گے۔ قرآن کے الفاظ یہ ہیں:

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۲﴾

(الانعام:۵۲)

''اور جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوش نودی کی طلب میں لگے ہوئے ہیں انہیں اپنے سے دور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں ہے اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں ہے۔ اس پر بھی اگر تم انہیں دور پھینکو گے تو ظالموں میں شمار ہوگے۔''

ان آیات کی تفسیر میں مولانا مودودیؒ اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں تحریر فرماتے ہیں:

''قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو نبیؐ پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ آپؐ کے گردوپیش ہماری قوم کے غلام، موالی اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اس شخص کو ساتھی بھی کیسے کیسے معزز لوگ ملے ہیں: بلالؓ ، صہیبؓ ، عمارؓ ، اور خبابؓ ۔ پھر وہ ان ایمان لانے والوں کی خستہ حالی کا مذاق اڑانے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے، بلکہ ان میں سے جس جس سے کبھی پہلے کوئی اخلاقی کم زوری ظاہر ہوئی تھی، اس پر بھی حرف گیریاں کرتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں جو کل تک یہ تھا اور فلاں جس نے یہ کیا تھا، آج وہ بھی اس برگزیدہ گروہ میں شامل ہے۔''

(تفہیم القرآن جلد اول صفحہ ۵۴۳: ۵۴۴)

قرآن میں صاف بتادیا گیا ہے کہ یہی کم زور، مظلوم اور غریب اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب ہیں۔ اللہ کے رسول کی نگاہ میں بھی معزز ہیں۔ دعوت کو جھٹلانے والے سرداروں، بااثر لوگوں اور مال داروں کی خاطر ان مومنین کو ہرگز دور نہیں کیا جائے گا۔ ان کے مقابلے میں بااثر اور طاقت ور لوگوں کی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ وہ رسولؐ کی دعوت پر ایمان نہ لائیں۔

اس تفصیل کو یہاں درج کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم ملک کے مظلوموں، کم زوروں اور محروم طبقات میں کام کی قرآنی اہمیت وضرورت کو سامنے رکھیں۔ اپنی اہم اور نازک ذمہ داری کو ادا کرنے کے لیے ذہنی وفکری طور پر تیار ہوجائیں۔ عملی اقدام کے لیے آگے بڑھیں۔ قرآن کی اس شہادت کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے کہ دعوت پیش کی جائے تو مظلوم اور محروم طبقات اس کی طرف رجوع کریں گے۔ کیوں کہ اسلام دین فطرت ہے۔ ہمارے ملک کی تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی ماضی میں اسلام کو پیش کیا گیا اور پیش کرنے والوں کی زندگی اسلام کا نمونہ تھی تو یہاں انہی مظلوم طبقات نے اسلام قبول کیا۔ چنانچہ آج جو مسلمان ملک میں ہیں، ان کا شاید 95 فیصد سے زائد ماضی کی مظلوم آبادی ہی ہے یہ کہیں باہر سے آ کر نہیں بس گئے ہیں۔ بلکہ اسی ملک کے باشندے ہیں۔ انہوں نے ملک کے

طول وعرض میں اچھی خاصی تعداد میں اسلام قبول کیا۔

ان حقائق کی روشنی میں ہمارے لیے یہ ترجیحی فریضہ قرار پاتا ہے کہ ہم اپنے قول اور عمل سے اسلام کی دعوت اور شہادت دیں۔ ان آبادیوں میں عام لوگوں سے بلند اخلاق سے پیش آئیں، ہمدردی اور مساوات کا رویہ اختیار کریں اور ان کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں۔ ان کی خدمت کر کے دل جیتنے کی کوشش کریں۔

اسلام مظلوموں کے حقوق کا علم بردار

رسولوں کی دنیا میں آمد کا ایک مقصد ہر طرح کے ظلم وستم کو مٹانا اور عدل وانصاف کو قائم کرنا رہا ہے۔ وہ ظالموں کو خبردار کرتے اور مظلوموں کے حامی ہوتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک اہم صفت عدل ہے۔ اللہ تعالیٰ ظلم وستم کو سخت ناپسند فرماتا ہے۔ قرآن میں اسی بات کو بار بار بیان کیا گیا ہے:

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ﴿۱۴۰﴾ (آل عمران: ۱۴۰)

''اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (النساء: ۴۰)

''بے شک اللہ تعالیٰ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔''

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا (یونس: ۴۴)

''یقیناً اللہ تعالیٰ لوگوں پر کچھ بھی ظلم نہیں کرتا۔''

ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''اے میرے بندو! میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام قرار دے رکھا ہے اور تمہارے درمیان بھی اسے حرام ٹھہرایا ہے، لہٰذا تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔'' (مسلم، مسند احمد)

اسی لیے مظلوم کی بددعا اور آہ وفریاد سے بچنے کی تعلیم دی گئی ہے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم دی ہے کہ ظالم کو ظلم سے روکنے کی

کوشش کی جائے اور مظلوم کا ساتھ دیا جائے۔ایک مرتبہ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم اپنے بھائی کا ساتھ دو، خواہ ظالم ہو یا مظلوم۔صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہؐ! مظلوم کا ساتھ دینا تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن ظالم کا ساتھ کیسے دیں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: اسے ظلم کرنے سے روکو، اس کا ہاتھ پکڑلو، یہی اس کا ساتھ دینا ہے۔'' (بخاری)

حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں: میں نے رسول اللہؐ کا یہ ارشاد سنا ہے کہ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے نہ روکیں تو بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے ان سب پر عذاب عام نازل کردے۔'' (ترمذی)

ظالم اور مظلوم کے تعلق سے قرآن اور سنت کی، ان اہم اور قیمتی تعلیمات کو سامنے رکھیے۔غور کرنے کی بات ہے۔ کیا ہم آج محروم، مظلوم اور استحصال کے شکار طبقات کے تعلق سے اپنا دینی فریضہ ادا کررہے ہیں۔حالاں کہ انصاف پسند اور انسان دوست غیر مسلم دانش ور اور صحافی ومذہبی رہ نما وقتاً فوقتاً ظلم وزیادتی کے خلاف اپنی آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔ہماری حیثیت خیر امت اور انسانیت کے خیر خواہ ہونے کے ناطے سب سے بڑھ کر ذمہ داری ہے۔ملک میں امت کی شناخت یہ ہونی چاہیے تھی کہ وہ خدا پرست اور خداترس انسانوں کا ایک گروہ ہے، جو ہر ظلم اور ظالم کے خلاف اور ہر مظلوم کے ساتھ ہے۔ایسا گروہ جو خود بھی عدل وانصاف پر قائم ہے اور سب کے لیے عدل وانصاف قائم کرنے کا علم بردار ہے۔قرآن میں بتایا گیا ہے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُونُوا۟ قَوَّٰمِينَ لِلَّهِ شُهَدَآءَ بِٱلْقِسْطِ ۖ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَـَٔانُ قَوْمٍ عَلَىٰٓ أَلَّا تَعْدِلُوا۟ ۚ ٱعْدِلُوا۟ هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ (المائدہ:۸)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ۔عدل کرو، یہ خداترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔''

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مسلمان بالعموم مظلوموں اور استحصال کے شکار

طبقات کے حق میں آواز بلند نہیں کرتے۔ مظلوم محسوس ہی نہیں کرتے کہ مسلمان ان کے ساتھ ہیں۔ مسلمان ہونے کا منشا یہ تھا کہ انسانیت اور خیر خواہی کے تقاضے کے تحت ظالموں کو ظلم وستم سے باز رکھتے۔ ظلم کے خلاف آواز بلند کرتے، مظلوموں کی دادرسی کرتے اور ان کے مسائل حل کرنے میں پیش پیش نظر آتے۔

فسادات کا ایک پہلو

ملک میں آزادی کے بعد ہزاروں فسادات ہو چکے ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی جان اور مال کا نقصان ہوتا رہا ہے۔ پولیس اور انتظامیہ کا رد یہ کچھ استثنا کے باوجود جانب دار رہا ہے۔ میڈیا نے بھی بالعموم جھوٹی افواہیں پھیلانے اور فرقہ وارانہ منافرت اور کشیدگی بڑھانے کا ہی کام کیا ہے۔ فسادات کے جائزے کے لیے قائم کی گئی کمیشنوں کی سفارشات پر آج تک عمل نہیں ہوا اور ان کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا۔ اہم پہلو یہ ہے کہ فساد بھڑکانے والوں، قتل ولوٹ مار اور خواتین کی عصمت دری کرنے والوں کو قرار واقعی سزائیں نہیں دی گئیں، بلکہ الٹا بے قصوروں کو پکڑ پکڑ جیل میں ڈالا گیا، جھوٹے اور فرضی مقدمے قائم کر کے ان کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔

راقم سطور کی ملاقات ایک ریاست کے شہر میں مظلوم طبقہ کے چند لیڈروں سے ہوئی۔ پتہ چلا کہ فسادات کے موقع پر انہیں مسلمانوں کے خلاف ورغلایا گیا تھا۔ اس طبقہ کے لوگوں نے مسلمانوں کے خلاف فسادات میں لوٹ مار، قتل وآتش زنی اور ظلم وزیادتی اور تشدد کے کام میں حصہ لیا۔ کچھ مدت بعد ان لیڈروں نے جماعت اسلامی ہند کے ذمہ داروں سے ایک ملاقات میں شرمندگی ظاہر کی اور ان واقعات پر افسوس کا اظہار کیا۔ آئندہ اس طرح کے کاموں سے دور رہنے کی بات بھی کہی۔ جماعت اسلامی ہند کے ذمہ داروں نے ان کو سمجھایا کہ اللہ تعالیٰ سب کا خالق اور مالک و پالن ہار ہے۔ وہ سارے انسانوں کو رزق دیتا اور ان کی ہدایت کا سامان کرتا ہے۔ وہ اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ وہ قتل وغارت گری، ظلم وتشدد، لوٹ مار کو سخت ناپسند کرتا ہے۔ ظالموں اور فساد برپا کرنے والوں کو اکثر وہ دنیا میں بھی سزا دیتا ہے اور اخروی زندگی میں تو اس نے جہنم کی خوف ناک آگ کی

شکل میں سخت سزا رکھی ہے، الّا یہ کہ کوئی سچے دل سے توبہ کرلے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلے۔

ان طبقات میں کام کی اہمیت اور ضرورت وافادیت کا یہ پہلو سامنے رکھنا چاہیے کہ فسادات میں ان کا استحصال نہ ہو۔ وہ ظلم وتشدد کے مرتکب نہ ہوں۔ دوسری طرف بالخصوص اتنی بڑی آبادی اور ان کے قائدین اور عام انسانوں سے مسلمانوں کے تعلقات اچھے ہوں۔ مل جل کر امن اور بھائی چارہ کے ساتھ رہیں۔

☆☆☆

اسلام اور محروم طبقات کے مفکرین

محروم اور دیگر مظلوم طبقات کے بعض قائدین اور دانش وروں نے اسلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بہت مثبت اور حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان ان خیالات سے ناواقف ہیں۔ ان قائدین اور دانش وروں کے نزدیک اسلام مظلوم طبقات کے حقیقی اور بنیادی مسئلہ کا حل ہے، اس کے علاوہ ان کے دیگر مسائل کو بھی حل کرتا ہے۔

ان کے بہت سے قائدین اور دانش وروں کے سامنے اسلام کا مکمل اور جامع تعارف، اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن وسنت اور سیرت رسولؐ کے ذریعہ نہیں ہوسکا تھا۔جس قدر وہ اسلام کو جانتے اور سمجھتے تھے، اس کی بنا پر بھی وہ جان گئے کہ اسلام واحد راہ نجات ہے، اس کا کوئی متبادل نہ پہلے تھا، نہ اب ہے۔ ان حقائق پر غور وفکر کرکے لائحہ عمل مرتب کرنے کے بجائے بعض کوتاہ بیں مسلم رہ نما اور سماجی کارکن ان کی تنظیموں اور سیاسی جماعتوں کے پیش کردہ (سیاسی یا غیر سیاسی) ایجنڈے پر عمل کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس پر آئندہ صفحات میں ہم تنقیدی نظر ڈالیں گے۔

اسلام کے حق میں مثبت رائیں رکھنے والے دانش وروں، قائدین اور سماجی مصلحین نے عقیدۂ آخرت کا تذکرہ نہیں کیا، لیکن مجموعی طور پر اسلام کو سراہا ہے۔ بعض قائدین کی رایوں کو اختصار کے ساتھ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

جیوتی با پھلے (1827-1890)

سید افتخار احمد سابق ایڈیٹر مراٹھی ہفتہ وار ’شودھن‘ ممبئی لکھتے ہیں :

''جیوتی با پھلے (پونہ) نے اسلام اور عیسائیت کی تعلیمات کو بہت سراہا، یہاں تک کہ یہ گمان ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ان دونوں میں سے کسی ایک دین کو خود قبول کرنے کا تہیہ کیا ہو اور اپنے پیرووں کو بھی اس کی تلقین کی ہو۔''
(مہاتما جیوتی با پھلے، حیات اور کارنامے، ص 13)

جیوتی با پھلے کو اسلام، پیغمبر اسلام اور مسلمانوں سے بہت عقیدت تھی۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کی اس ملک میں آمد کو خوش آمدید کہنے والے غالباً پہلے دلت سماجی مصلح ہیں۔ انھوں نے فراخ دلی سے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تحسین کی ہے، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔

''ایک کتاب 'سنسار نمبرا' میں جیوتی با پھلے نے ایک اعلیٰ ذات کے فرد اور شودر کے درمیان فرضی مکالمہ کرایا ہے۔ اس میں شودر سے وہ پوچھتا ہے: تمہارا دھرم کیا ہے؟ اس پر شودر جواب دیتا ہے: کیا ہمارا دھرم صرف تمہاری خدمت کرنا ہے، ہم اپنی سہولت سے جب چاہیں محمدی (اسلام) یا کرسچین مذہب اختیار کریں گے، یا خالق سے کوئی اچھا مذہب مانگ لیں گے، تم ہماری فکر نہ کرو۔'' (ایضاً صفحہ 79)

پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کی عقیدت، بلکہ اسلام سے عقیدت کی جیتی جاگتی تصویر وہ طویل نظم ہے جو انہوں نے 'مانو محمدؐ' کے نام سے لکھی ہے۔ اس نظم میں انہوں نے حضرت محمدؐ کی تعلیمات میں سے توحید کی حقیقت اور شرک کی تردید، انسانی بھائی چارہ، اسلامی مساوات اور سماجی انصاف کو بہت سراہا ہے۔

''تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے پھلے کہتے ہیں کہ جن شودروں پر ظلم ہوا انہیں مسلمانوں نے اسلام کی آغوش میں لیا اور اس طرح آریہ قوم کی غلامی سے نجات دلائی، مسلمان ہندوستان کے حاکم بنے، لیکن بعد میں عیش پرست ہوئے، اسی وجہ سے انگریز ان پر مسلط ہوئے۔'' (ایضاً صفحہ 95)

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر (1956 - 1891)

ڈاکٹر امبیڈکر ہندوستان کے دستور کے معمار ہیں۔ بیرون ملک سے علم وتحقیق

میں بہت اونچی ڈگریاں رکھتے تھے۔ یورپ کی بڑی یونی ورسٹیوں نے انہیں اعزاز سے نوازا تھا۔ وہ مختلف علوم کا نہایت گہرائی سے مطالعہ کر چکے تھے۔ وہ پوری زندگی مظلوم ومحروم طبقات کے حقوق، عزت نفس، مساوات اور سماجی انصاف کے لیے لڑتے رہے۔ بدقسمتی سے انہیں اسلام کو اس کے ماخذ سے راست سمجھنے کا موقع کم ہی ملا۔ جو مسلمان ان کے قریب تھے وہ انھیں کماحقہ، اسلام کو نہیں سمجھا سکے۔ جس قدر موقع ملا انہوں نے اسلام کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انہوں نے یقین کے ساتھ کہا کہ دلتوں اور پس ماندہ آبادیوں کی حالت میں تبدیلی لانا ہو تو مذہب کی تبدیلی ضروری ہے۔

اسلام کے بارے میں ان کے خیالات ملاحظہ فرمائیں:

''اگر آپ کو انسانیت سے محبت ہو تو دھرم تبدیل کرو۔ تمام دلت اچھوتوں کی صدیوں سے غلام بنائے ہوئے طبقے کی آزادی کے لیے متحد ہونا ہو تو دھرم تبدیل کرو۔ مساوات حاصل کرنی ہو تو دھرم تبدیل کرو۔ انسانی سکھ چین چاہتے ہو تو دھرم تبدیل کرو۔''

(دلت ورگ کو دھرمانترن کی آوشکتا کیوں؟ صفحہ 51)

ایک اور اقتباس ملاحظہ کریں:

''تین دھرم ہیں جن میں سے دلت طبقے کو ایک کا انتخاب کرنا ہے:

(۱) اسلام دھرم (۲) عیسائی دھرم (۳) سکھ دھرم

ان تینوں کا تقابل کرنے پر اسلام دھرم دلت طبقے کو وہ سب کچھ دیتا ہوا دکھائی دیتا ہے جو اسے چاہیے۔''

(Thus Spoke Ambedkar vol IV By Bhagwandas P.296-297)

ان اقتباسات کو درج کر کے آر ایس عادل اپنی کتاب 'باباصاحب امبیڈکر اور اسلام' میں تحریر فرماتے ہیں:

''باباصاحب نے اسلام دھرم کو دلت طبقے کا مقصد پورا کرنے والا بتایا تو پھر انہوں نے اسلام کو کیوں نہیں اپنایا؟ جب کہ 14/ اکتوبر 1956 کو اپنے لاکھوں شاگردوں کے ساتھ بدھ دھرم کیوں قبول کیا؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔''

وہ اس سوال کا جواب ان الفاظ میں دیتے ہیں:

''باباصاحب ایک عظیم اسکالر ہی نہیں، اعلیٰ درجے کے بیرسٹر بھی تھے، اس لیے 1956 میں جب انہوں نے دھرم تبدیل کرنے کی بات سوچی تو دھرم کی تبدیلی کے لیے پہلے سے طے کیے ہوئے مقصد (خارجی قوت کا حصول) یعنی کسی بھی باہری سماج کی قوت حاصل کرنے کو پیش نظر رکھا تھا۔ اس کے مطابق انہوں نے سوچنا شروع کیا کہ ہندو سماج کے علاوہ کس سماج کی قوت اس دیش میں ایسی ہے جسے حاصل کر کے دلت طبقے کے لوگ مظالم سے محفوظ رہ سکیں اور عزت کی زندگی بسر کرسکیں۔ انہوں نے جانا کہ اس دیش میں نہ تو عیسائی سماج کی قوت ہے نہ بدھ سماج کی اور نہ ہی اسلامی سماج کی۔ 1947 (آزادی اور ملک کی تقسیم) کے بعد دوسروں کی طرح مسلمانوں کی قوت بھی ہمارے دیش میں نہ کے برابر رہ گئی تھی، یعنی ہمارے دیش میں کسی اور سماج کے پاس ایسی قوت نہیں تھی جسے پا کر یعنی جس میں اپنے کو ضم کر کے ظلم اور زیادتیوں سے نجات مل سکتی۔ لیکن باباصاحب کو اپنا عظیم عہد پورا کرنا تھا۔ جب انہوں نے پایا کہ اس دیش میں کوئی بھی ایسا سماج نہیں ہے جس کی قوت میں ضم ہو کر دلت طبقے کو مصیبت اور مظالم سے بچایا جاسکے تب انہوں نے ہمارے دیش کے قریبی ملکوں کی طرف نگاہ دوڑائی کہ کیا ان میں کوئی ایسا سماج رہتا ہے جس کی قوت حاصل کر کے اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہوسکیں۔ انہوں نے جانا کہ چین، جاپان، لنکا، برما اور تھائی لینڈ وغیرہ ممالک میں بدھ مذہب ماننے والا سماج ہے۔ اس لیے خارجی قوت پانے کے لیے بدھ دھرم اختیار کرنا چاہیے۔ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ان دنوں کسی دوسرے دھرم کو اختیار کر کے مقصد کے حصول میں دشواری ہوسکتی تھی اور بدھ دھرم کو اپنا کر ہی مقصد کو پانا آسان معلوم پڑتا تھا۔ اس لیے باباصاحب نے بدھ دھرم اختیار کیا تھا۔'' (ڈاکٹر امبیڈکر اور اسلام، صفحہ 15—16)

یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ ڈاکٹر امبیڈکر ملک کی دلت وپس ماندہ آبادی کے تقریباً متفقہ لیڈر تھے۔ انہوں نے پورے ملک میں دلتوں اور پس ماندوں کے لیے سماجی آزادی اور عدل وانصاف کے حصول کی مہم چلا رکھی تھی اور اس کے لیے وہ انتھک جدوجہد کررہے تھے۔ ان کا نعرہ تھا: ''تعلیم حاصل کیجیے، متحد ہوجائیے اور جدّوجہد کیجیے۔'' اور یہ بات بھی ان کے نزدیک طے تھی کہ آبائی مذہب کو چھوڑے بغیر مطلوبہ سماجی آزادی، حق وانصاف اور مساوات کا حصول ممکن نہیں۔ 1936 میں انھوں نے جو کھلے طور پر مذہب کی تبدیلی کا عندیہ دیا تھا اس کے لیے ذاتی طور پر وہ مختلف مذاہب کا مطالعہ بھی کررہے تھے۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہے کہ ان کے نزدیک مذہب انسانوں کا پرائیوٹ معاملہ نہیں تھا۔ وہ مذہب کو فکر ونظر کی تبدیلی کے ساتھ تہذیب وتمدن کی تبدیلی اور حقیقی سماجی انصاف کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اس سلسلے میں غور وفکر کے پیش نظر خود بھی پوری وسعت نظری سے کام لیا اور اپنے پیروکاروں کو بھی اس کی تعلیم دی۔ لہٰذا 36ء تا 56ء اور اس میں بھی بالخصوص ابتدائی دس سال، یعنی 36 تا 46 انتہائی اہمیت کے حامل تھے۔

ڈاکٹر امبیڈکر کے نزدیک تبدیلی مذہب کے پیش نظر سب سے بڑا مسئلہ اپنی پس ماندہ قوم کے تحفظ کا تھا جو ملک بھر کی تمام ریاستوں کے قصبوں، گاؤں اور دیہاتوں میں انتہائی پس ماندہ حالت میں زندگی گذار رہی تھی۔ یہ حسن اتفاق ہے کہ ملک کے طول وعرض میں یہ دلت اور پس ماندہ بستیاں مسلمان بستیوں کے عموماً متصل آباد تھیں اور یہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے انہیں اچھوت نہیں سمجھا تھا، مسلمان گھروں اور محلوں میں ان کی آمدورفت تھی، ان کی اکثر آبادی مسلمانوں کے گھروں اور کھیتوں میں کام کرتی تھی اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا بہتر رویہ تھا۔ امبیڈکر سوچتے تھے کہ تبدیلی مذہب کے نتیجے میں ملک کے طول وعرض میں پھیلی اس انتہائی خستہ حال آبادی (6 تا 8 کروڑ) کا اعلیٰ ذاتوں کی عین ممکنہ دست درازی اور مظالم (بلکہ نسل کشی) سے تحفظ کس طرح ہوگا۔

دلت طبقے کو بدھ مذہب قبول کرنے کی ترغیب دے کر اور قبول کرکے باباصاحب بہ مشکل دو ماہ زندہ رہے۔ بدھ مذہب قبول کرنے کے بعد فائدہ ہوا یا نہیں،

اسے وہ نہیں جان سکے، البتہ انہوں نے اپنا قول پورا کردکھایا کہ وہ دلت بن کر ہندو دھرم میں پیدا ہوئے تھے، جو ان کے اختیار میں نہیں تھا لیکن وہ ہندو نہیں مریں گے، یہ ان کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

راما سوامی نائیکر (1879–1973)

باباصاحب امبیڈکر کے زمانے میں دلت طبقات کے ایک بڑے خیرخواہ مدراس کی ایک شخصیت راما سوامی نائیکر تھے۔ ان کو پری یار کہا جاتا تھا۔ اسلام کے بارے میں ان کے خیالات بالکل واضح ہیں۔ ان کا درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

"دوستو! شودر پن کی ہماری بیماری بہت خطرناک ہے یہ کینسر کی طرح ہے، بہت پرانی بیماری ہے۔ اس کے لیے صرف ایک ہی دوا ہے اور وہ ہے اسلام، اس کے علاوہ کوئی دوسری دوا نہیں۔ پری یار پھر آگے کہتے ہیں: "میں اسلام کی وکالت نہیں کر رہا ہوں، میں اس کی تبلیغ بھی نہیں کر رہا ہوں، لیکن یہ ایک سچائی ہے۔

(باباصاحب امبیڈکر اور اسلام، آر یس عادل، صفحہ 26)

پری یار نے اسلام کی بنیادی تعلیم کو کس طرح سمجھا ہے، درج ذیل اقتباس کے مطالعہ سے واضح ہوگا:

"اسلام کا قیام، شرک (بہت سے خداؤں کو ماننے) اور جنم کی بنیاد پر نابرابری کو ختم کرنے کے لیے ہوا تھا، ایک خدا اور ایک انسان کے اصول کو قائم کرنے کے لیے ہوا تھا۔ اندھ وشواس اور بت پرستی کو ختم کرنے کے لیے اور عقلی اصولوں پر منحصر زندگی بسر کرنے کے لیے ہوا تھا۔" (ایضاً، صفحہ 25)

پتت پاون داس

یہ مہاراشٹر کے دلت طبقے میں پیدا ہوئے ایک سنت تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے حامی اور جانشین تھے۔ ایک خطبہ میں پتت پاون داس نے کہا: "اسلام ایک مکمل اور عالمی مذہب ہے، جو اپنے سبھی ماننے والوں سے برابری کا برتاؤ رکھتا ہے۔ یہ تلوار نہیں تھی کہ اسلام کا اتنا اثر ہوا، بلکہ واقعی یہ تھی سچائی اور مساوات، جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے۔"

Thus Spoke Ambedkar Vol IV by Bhagwandas p.144-145

تبصرہ

بعض معروف دلت رہ نماؤں کے اسلام کے بارے میں ان عمدہ خیالات سے ان کے درمیان کام کرنے والوں کو حوصلہ ملتا ہے۔ ان خیالات سے مظلوم طبقات بالعموم واقف نہیں ہیں، اس لیے اس حوالے سے کام کا ایک وسیع میدان پایا جاتا ہے۔

محروم بھائیوں اور دیگر مظلوم طبقات میں کام کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کا صحیح تعارف اور تقاضوں کو سمجھانا ضروری ہے۔ اسی طرح مروّجہ مذہب اور دین میں فرق کو بھی واضح کرنا چاہیے۔ شرک کی تردید حکمت اور داعیانہ دردوسوز کے ساتھ کرنی چاہیے۔ ان حقائق کو پیار ومحبت اور نرمی سے انھیں سمجھانا چاہیے۔ وہ سابقہ مذہبی پس منظر کی وجہ سے ایک ایسے خدا کے بارے میں سوچتے ہیں جس نے ان کو اپنے پیروں سے پیدا کیا۔ انہیں سمجھانا ہوگا کہ اسلام کے تصورِ خدا میں نسل اور پیدائش کی بنیاد پر امتیاز کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے اپنے سابقہ تصور کے تحت وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اسلام بھی کچھ رواجوں، رسموں اور باپ دادا کے زمانے کی آستھاوں کا نام ہے۔ یہاں بھی اندھ وشواس ہے، ظلم اور تشدد خدا اور مذہب کے نام میں روا رکھا گیا ہے، حالاں کہ اسلام ان سب خرابیوں سے بالکل پاک ہے۔

ظاہر ہے کہ اسلام کا تصورِ خدا اور تصورِ مذہب مشرکانہ تصورات سے بالکل مختلف ہے۔ دونوں میں بنیادی اور جوہری فرق ہے۔ اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے اور ایک Code of Conduct ہے۔ وہ دنیوی مسائل کا حل بھی ہے اور دنیوی فلاح وبہبود اور مادی ترقی اور خوش حالی کی ضمانت دیتا ہے، نیز اخروی نجات اور جہنم کے عذاب سے بچنے کے لیے واضح اور مکمل رہ نمائی کرتا ہے۔ اسلام کے بارے میں یہ باتیں محض افسانہ نہیں، بلکہ عملاً اسلام عرب میں قائم ہوا اور اس کی برکتوں اور رحمتوں کا تاریخی ریکارڈ محفوظ ہے۔

بعض دانش وروں کا کہنا ہے کہ خدا، آخرت، جنت اور دوزخ، یہ سب آنکھوں کو نظر نہیں آتے، اس لیے وہ ان باتوں کو تسلیم نہیں کریں گے۔ ان حضرات کو سمجھانا ہوگا کہ کتنی ہی اشیا ایسی ہیں جو آنکھوں کو نظر نہیں آتی ہیں لیکن ہم کسی قابل اعتماد، معتبر اور دوست کے کہنے پر مان لیتے ہیں۔ اسے تسلیم کرنے کو غیر سائنٹفک اور غیر عقلی نہیں کہتے۔ خدا

ہماری مادی آنکھوں سے دیکھنے کی ہستی نہیں ہے۔اسے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے ہماری ہدایت اور رہ نمائی پر کیا اثر پڑنے والا ہے؟اسے آنکھوں سے دیکھ لینے والا اس کا انکار کس طرح کرے گا؟ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد اس کا اقرار کس کام کا، سارا امتحان تو اسی میں ہے کہ انسان اسے آنکھوں سے نہ دیکھتے ہوئے، اُس کے وجود کی نشانیوں پر غور کر کے اس پر ایمان لائے۔اس کی بے شمار نشانیاں انسان کے اپنے وجود میں اور زمین اور آسمانوں میں پائی جاتی ہیں۔

☆☆☆

ذاتوں کی کش مکش اور مسلمان

ہمارے ملک میں ہزاروں ذاتیں (Casts) پائی جاتی ہیں، پھر مزید تقسیم کے نتیجے میں ذیلی ذاتیں (Subcasts) بھی ہیں۔ یہ کتنی دردناک تقسیم ہے۔ان کے درمیان ذاتوں کی بنیاد پر فرق اور امتیاز برتا جاتا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ بڑے چھوٹے یا اعلیٰ اور ادنی کے تصورات کے تحت عملی زندگی میں ناروا سلوک کیا جاتا ہے جو حد درجہ غیر انسانی ہے، آپس میں شادی بیاہ نہیں اور چھوا چھات موجود ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا ایک ہے، کائنات بھی ایک ہے، انسان کو بھی ایک ہونا چاہیے۔انسانوں نے پیدائش، رنگ و زبان اور علاقہ کی بنیادوں پر انسانوں کو اعلیٰ ادنیٰ میں بانٹ دیا۔ اونچی دیواریں کھڑی کر دیں کہ وہ ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ ایسی صورت حال میں ہم محض تماشائی بن کر نہیں رہ سکتے۔ اہلِ حق کو خاموش نہ رہنا چاہیے، بلکہ حالات کو بدلنے کا عزم کر کے عملی قدم اٹھانا چاہیے۔ انسانوں کی دردناک تقسیم کی دوا صرف اسلام ہے۔ اسلام ساری دنیا کے انسانوں کو وحدت الٰہ، وحدت انسان اور وحدت نظام کی مضبوط بنیادوں پر ایک لڑی میں پرو کر آپس میں انہیں بھائی بھائی بنا دیتا ہے۔ قرآن وحدیث کے درج ذیل ارشادات ملاحظہ فرمائیں:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَٰكُم مِّن ذَكَرٍ وَأُنثَىٰ وَجَعَلْنَٰكُمْ شُعُوبًا وَقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوٓا۟ ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ ٱللَّهِ أَتْقَىٰكُمْ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ﴿١٣﴾ (الحجرات: ۱۳)

''لوگو! ہم نے تمھیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تمھیں ذاتوں اور قبیلوں میں اس لیے بانٹ دیا ہے کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اور اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے۔''

حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''لوگو! تمہارا رب ایک ہے، تمہارا باپ بھی ایک ہے، کسی عربی کو کسی عجمی پر، کسی عجمی کو کسی عربی پر، کسی گورے کو کسی کالے پر، کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں، سوائے تقویٰ کے۔'' (مسند احمد)

اسلام سب کو یکساں طور پر مخاطب کرتا ہے۔ اُس کی دعوت سب کے لیے ہے۔ موجودہ صورت حال میں ہمارا فریضہ ہے کہ وحدت الٰہ وحدت آدم اور وحدت دین کے پیغام کی بنیاد پر اس کش مکش کو ختم کر کے انہیں بھائی بھائی بنا دیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٣﴾ (الانفال: ٦٣)

''وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمہاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے۔ تم روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دل نہ جوڑ سکتے تھے، مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑ دیے۔ یقیناً وہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔''

اسلام میں انسانی مساوات کے بعض عملی نمونے ہمیں سیرت نبوی اور اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں۔

ا—حضرت زینب بنت جحشؓ پیغمبر اسلام کی پھوپھی زاد بہن تھیں اور قریش کے اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ اس زمانے میں کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی کا نکاح کسی غلام کے ساتھ ناقابل تصور تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رسم کو توڑنے کے لیے

یہ فیصلہ فرمایا کہ زینبؓ کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام کے ساتھ کر دیا جائے۔ چنانچہ حضرت زید بن حارثہؓ کے ساتھ آپؐ نے ان کا نکاح کر دیا۔ یہ انتہائی انوکھا واقعہ تھا۔

(فتح الباری تفسیر سورہ احزاب بحوالہ ابن ابی حاتم)

۲۔ کعبہ کی چھت پر صرف نام نہاد شریف قبیلہ کے افراد ہی چڑھ سکتے تھے۔ نچلے طبقے کے کسی فرد کا کعبہ کی چھت پر چڑھنا قدیم زمانہ کے لوگوں کو کسی طرح گوارا نہ تھا۔ مکہ فتح ہوا تو پیغمبر اسلامؐ نے اس رسم کو اس طرح توڑا کہ آزاد کردہ غلام حضرت بلال بن رباحؓ کو حکم دیا کہ وہ کعبہ کی چھت پر چڑھیں اور اس کے اوپر کھڑے ہو کر اذان دیں۔ یہ عرب کی تاریخ میں انوکھا واقعہ تھا۔

(سیرت النبی جلد اول ص ۳۱۱ مطبوعہ ۱۹۹۱ بحوالہ ابن ہشام)

۳۔ خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ مصر کے حاکم حضرت عمرو بن العاصؓ کے لڑکے محمد بن عمروؓ ایک قبطی پر غصہ ہو گئے اور اس کو کوڑے سے مارا۔ یہ قبطی مصر سے چل کر مدینہ آیا اور حضرت عمر فاروقؓ سے فریاد کی۔ انھوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ محمد بن عمروؓ نے اس کو ناحق مارا ہے۔ انہوں نے فوراً اپنا آدمی مصر بھیج کر حاکم مصر اور ان کے لڑکے کو بلایا۔ جب وہ آ گئے تو قبطی سے کہا کہ ان کو مارو۔ قبطی نے حاکم مصر کی موجودگی میں ان کے لڑکے کو مار مار کر لہولہان کر دیا۔ جب وہ پوری طرح مار چکا تو حضرت عمر فاروقؓ نے حضرت عمرو بن العاصؓ اور ان کے لڑکے کو مخاطب کر کے کہا: ''تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے ان کو آزاد جنا تھا۔''

(حوالہ کنز العمال، جلد دوم، صفحہ ۴۵۵)

اسلامی تاریخ میں مساوات کے بے شمار واقعات ملتے ہیں۔ محروم طبقات میں اسلام اور اس کی ان تعلیمات کا صحیح تعارف کرایا جائے اور واقعات کو پیش کر کے عملی نمونے ان کے سامنے رکھیں تو یقیناً لوگ متاثر ہوں گے۔

ایک قابل توجہ پہلو

مسلمانوں کو ٹھنڈے قلب و ذہن کے ساتھ غور کرنے کے لیے ایک اہم پہلو

سامنے رکھا جارہا ہے۔

ملک کے مختلف مقامات پر بعض مسلمانوں کو محروم ومظلوم طبقات کی تنظیموں اور اداروں کے پروگراموں، کانفرنسوں اور اہم جلسوں میں شرکت کا موقع ملتا ہے۔ یقیناً ایسے مواقع پر ان کی شرکت ضروری ہے۔ جو مسلمان مقررین کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں اور پروگراموں میں باقاعدہ حصہ لیتے ہیں۔ بالعموم دیکھا گیا ہے کہ ان کی تنظیموں کے زیر اثر انہی کے ایجنڈے کے تحت اظہار خیال کرتے ہیں۔ ان کے پیغام اور پروگرام کی تائید اور تعاون کی باتیں کرتے ہیں۔ اس سے ہٹ کر کوئی حل اور ایجنڈا پیش نہیں کرتے۔ کیا اس ایجنڈے سے محروم بھائیوں کا بنیادی مسئلہ اور دیگر مسائل حل ہوں گے؟ کیا ان کوششوں کے نتیجے میں ان کو عزت، برابری، خودداری اور سماجی انصاف حاصل ہوسکتا ہے؟ سب سے بڑھ کر یہ کہ کیا محروم بھائیوں اور مظلوم طبقات کے لیے اخروی زندگی میں عذاب جہنم سے بچنے کا یہی راستہ ہے؟ اللہ اور اس کے رسولؐ سے بڑھ کر مظلوموں اور محروم کا خیر خواہ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ ان کے بنیادی مسئلے اور حالات کو بہتر بنانے کے لیے جو پروگرام اللہ تعالیٰ اور اس کے آخری رسولؐ نے دیا ہے، اس سے بڑھ کر کام یاب کوئی دوسرا نسخہ نہیں ہے۔ تاریخ میں اسلام کے سوا کوئی مذہب یا نظریہ انسانی مساوات اور سماجی عدل قائم کرنے میں کبھی کام یاب نہیں ہوا ہے۔ پچھلے صفحات میں اس کی صداقت سمجھائی گئی ہے۔

مسلمانوں کے لیے، بالخصوص جو ان کی تنظیموں، تحریکوں اور اداروں کے مختلف کانفرنسوں اور پروگراموں میں مقررین کی حیثیت سے شریک ہوتے ہیں، ضروری ہے کہ اسلام کا صحیح تعارف کرائیں اور اس کی روشنی میں ان کے مسائل کا حل پیش کریں، اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کریں، زندگی کے مسائل کا واحد حل اسلامی نظام زندگی اور اسلامی معیشت کا تعارف کرائیں اور مظلوم بھائیوں کو اس پر غور کرنے کی دعوت دیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ فرد ہو یا کوئی انسانی گروہ، زندگی میں مسائل پیدا ہونے، ظلم واستحصال کا شکار ہوجانے اور فساد وبگاڑ کا بنیادی سبب خدا کی ہدایت اور رہ نمائی سے منہ موڑنا اور آخرت کی جواب دہی سے انکار ہے۔ جب تک ان دونوں بنیادی اسباب کو دور

کر کے ایمان اور آخرت کی جواب دہی کا یقین پیدا نہیں ہوگا، انسان کے مسائل کا پائیدار حل اور اس کی اخروی نجات کے حقیقی مسئلہ میں کام یابی ممکن نہیں ہے۔

آج محروم اور مظلوم طبقات کی صحیح رہ نمائی کرنا نہایت ضروری ہے۔ ان کے ایجنڈے، جو زیادہ تر سیاسی اقتدار کے حصول سے متعلق ہیں، محدود فائدوں کے حصول کے سوا ان کے اصل مسئلہ کو حل نہیں کر سکتے۔ ان کے ایجنڈے کو لے کر چلنے میں مسلمانوں کا نقصان تو ظاہر ہے کہ وہ داعیانہ مقام اور حیثیت سے گر جائیں گے۔ انتقام کا ایجنڈا اسلام کی راہ کے لیے رکاوٹ بن جائے گا، مسلمانوں کی تصویر حریف اور فریق کی ہوگی اور دعوت کو وہ اس طرزِ عمل سے سخت نقصان پہنچائیں گے۔ کیا مسلمان یہ سب کر کے اسلام کے پیرو ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟ اس طرح وہ اللہ تعالیٰ کی شدید ناراضی کا خطرہ مول لیں گے اور اخروی باز پرس اور گرفت کی زد میں آئیں گے۔

اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ منفی ایجنڈے کی بنیاد پر کوئی قابلِ ذکر کارنامہ یا تعمیری کام دنیا میں انجام نہیں پاتا۔ انتقام منفی ایجنڈا ہے۔ مظلوم کی نفسیات ایسی ہوتی ہے کہ وہ بدلہ لینے پر قادر ہو اور بدلہ لینے لگے تو پھر اسے ظالم بننے میں دیر نہیں لگتی۔

محروم ومظلوم آبادیوں میں کام کرنے والی تنظیموں اور اداروں کا عام ایجنڈا 'سیاسی اقتدار کا حصول' ہے۔ اس کے لیے وہ مسلمانوں سے کہتے ہیں کہ ان کا ساتھ دیں۔ اس اتحاد کے ذریعہ سیاسی سطح پر اقتدار حاصل کر لیا جائے۔ ان کے بہ قول مسلمان اس ملک میں مظلوم ہیں۔ فسادات کا شکار ہوتے ہیں، اس لیے محروم ومظلوم طبقہ اور مسلم اتحاد کے ذریعہ اقتدار حاصل کر کے ظالموں سے بدلہ لیا جائے تبھی انقلاب آئے گا اور سماجی انصاف کا حصول ممکن ہو سکے گا۔ مسلمان اور دیگر اقلیتیں ان کا ساتھ دیں۔ مذہب کے فرق کو اس جدوجہد میں حائل ہونے نہ دیں۔ جس کا جو مذہب ہے وہ اس پر عمل پیرا ہو۔ وہ کہتے ہیں ہماری یہ جدوجہد غیر مذہبی Non Religious ہو اور ایک سماجی ومعاشی تحریک Socio Economic Movement کے طور پر ہو۔

بہ ظاہر ان کی باتیں اچھی اور معقول لگتی ہیں، لیکن مسلمانوں کو اپنا مقام ومنصب

سامنے رکھنا چاہیے اور زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر غور کرنا چاہیے تا کہ صحیح نتیجہ تک پہنچا جاسکے۔

راقم سے دلت تنظیموں کے قائدین ملتے ہیں اور احباب کے ساتھ ان سے ملاقات کے لیے بھی جانا ہوتا ہے۔ کبھی نشستوں میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ملاقاتیں رہتی ہیں دراصل ان کا بنیادی مسئلہ سیاسی نہیں، بلکہ سماجی اور انسانی ہے۔ یہ انسان کی بنیادی سوچ کا مسئلہ ہے اور ذہنی ساخت (Mind Set) کی تبدیلی کے ذریعہ ہی حل ہوسکتا ہے۔ اسلامی تصور انسان، تصور خدا اور تصور حیات و کائنات، کا نتیجہ یہ ہے کہ اہلِ اسلام انسانوں کو پست اور ادنی اور حقیر و ذلیل نہیں سمجھتے اور ان کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ سے رکتے ہیں۔ آخرت کی باز پرس کا یقین ہر طرح کے ظلم وتشدد سے اہل ایمان کو روکتا ہے۔ دنیا میں انسان قانون، پولیس، جیل اور عدالت سے تو بچ سکتا ہے، لیکن خدا کی آخری عدالت میں تو کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ اس ضمن میں درج ذیل واقعات پر غور فرمائیے۔

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک بار اپنی اہلیہ حضرت ام سلمہؓ کے حجرے میں تھے۔ آپؐ نے کسی کام کے لیے خادمہ کو بھیجا۔ وہ باہر گئی تو وہاں کھیل کود دیکھنے لگی اور واپسی میں دیر کردی۔ کافی دیر کے بعد وہ واپس آئی۔ اس وقت آپؐ کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ آپؐ کے چہرے پر غصے کے آثار ظاہر ہوگئے، تاہم آپؐ نے خادمہ سے صرف اتنا کہا: ''اگر مجھے قیامت میں بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تجھ کو اس مسواک سے مارتا۔''

ایک صحابی ابومسعود انصاریؓ ایک بار کسی غلطی پر اپنے غلام کو مارنے لگے۔ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزرے۔ آپؐ نے فرمایا: اے ابومسعودؓ! جان لو کہ جتنی قدرت تم کو اس غلام پر ہے، اس سے زیادہ قدرت تمہارے اوپر اللہ کو ہے۔ یہ سنتے ہی ابومسعودؓ کے ہاتھ سے ڈنڈا چھوٹ کر گر پڑا۔ انہوں نے غلام سے کہا: جاؤ تم آزاد ہو۔

ابومسعودؓ اپنے اور غلام کے درمیان فرق دیکھ رہے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بڑا اور طاقت ور سمجھ رہے تھے اور غلام کو چھوٹا اور کم زور مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حقیقت کی یاددہانی کرائی تو ان کو معلوم ہوا کہ جہاں میں نے غلام کو کھڑا کر رکھا ہے، وہیں میں

خود بھی کھڑا ہوں، کیوں کہ اصل مقابلہ انسان اور انسان کا نہیں ہے، بلکہ انسان اور خدا کا ہے اور خدا کے مقابلے میں، میں اس سے کہیں زیادہ چھوٹا ہوں جتنا چھوٹا میں غلام کو سمجھ رہا ہوں۔

انسانوں میں ناروا فرق کا احساس سماجی ناانصافی پیدا کرتا ہے۔ جب یہ فرق مٹ جائے تو سماجی ناانصافی کا خاتمہ ممکن ہے۔ اس طرح ہر معاملہ انسان اور انسان کے درمیان کا نہ ہو کر خدا اور انسان کے درمیان کا معاملہ بن جاتا ہے۔ ایک طرف خدا ہوتا ہے اور دوسری طرف تمام انسان۔ خدا کے مقابل کوئی بھی طاقت ور نہیں، ہر آدمی اپنے آپ کو عجز کی حالت میں محسوس کرتا ہے، جہاں وہ دوسرے کو فرض کیے ہوئے تھا۔

یہ بلا شبہ سماجی انصاف کا سب سے زیادہ طاقت ور محرک ہے۔ جس آدمی کے اندر یہ احساس بیدار ہو جائے، وہ کسی حال میں دوسرے کے اوپر ناانصافی کی جرأت نہیں کر سکتا۔'' (انسانی مساوات و سماجی عدل صفحہ 9 تا 11)

مشترکہ پروگرام

سیاسی فضا کی تبدیلی کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ درج ذیل نکات پر مشترکہ پروگرام بن سکتا ہے:

- ملک میں جمہوری قدریں اور جمہوری فضا برقرار رہے۔
- دستور میں جو حقوق اور تحفظات دلتوں، ٹرائبلس اور اقلیتوں کو حاصل ہیں وہ انہیں عملاً دیئے جائیں ان کی خلاف ورزی سے حکومتیں باز آجائیں۔
- فرقہ وارانہ فسادات کی روک تھام کے لیے متحدہ کوششیں کی جائیں۔
- فرقہ وارانہ اور فسطائی رجحانات اور سرگرمیوں سے اہل ملک کو بچایا جائے۔
- سماجی خرابیوں اور اخلاقی بگاڑ، شراب، زنا، فحاشی، جنسی جرائم اور عریانیت کے خلاف مختلف سطح پر کام کیے جائیں۔
- تعلیم کی اخلاقی قدروں کو آگے بڑھایا جائے، کم از کم اس کا بھگوا کرن نہ ہو۔

مزید ایسے نکات ہو سکتے ہیں جہاں متحدہ کوششوں کی گنجائش ہے اور ضرورت بھی۔ مختصر پروگرام بنا کر اس پر عمل درآمد ہی اصل کامیابی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ تعلیم اور روزگار میں ریزرویشن، دیگر مراعات، دستوری تحفظات اور سیاسی اقتدار وغیرہ محروم اور مظلوموں کے بنیادی اور دیگر مسائل کا مستقل حل نہیں ہیں۔ حقیقی حل اسلام ہے۔ اس کے ساتھ موت کے بعد کی ہمیشہ کی زندگی میں کام یابی اور نجات کا مسئلہ سب سے بڑا اور اہم ہے۔ اس کا حل بھی اسلام پیش کرتا ہے۔ ہم ان سب باتوں کو حکمت، نرمی اور محبت کے ساتھ دعوتی جذبے سے محروم اور مظلوم طبقات کے سامنے غور وفکر کے لیے پیش کریں۔ اس کے لیے ہمیں خود یقین ہونا چاہیے کہ اسلام ہی واحد حل ہے۔ یہ خدائی نسخہ ہے۔ باقی فارمولے انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں اور ان کی ناکامی ظاہر ہے۔

پیش رفت کی صورتیں

مظلوم طبقات میں کام کی اہمیت وضرورت اور افادیت کا ایک اہم پہلو قابل توجہ ہے۔ یہ آبادی چار ہزار سالوں سے ظلم وستم، ذلت اور غیر انسانی سلوک سہتی چلی آرہی ہے، ذات پات کے نسلی تفریق پر مبنی نظام کا شکار ہے۔ ان مظلوموں کے حالات میں آزادی وطن کے بعد مختلف اسباب کی بنا پر کچھ فرق ضرور آیا ہے، لیکن بنیادی مسئلہ اور دیگر مسائل جوں کے توں ہیں۔ اس کا حل اسلام میں موجود ہے۔ لہٰذا مسلمانوں اور دینی جماعتوں کے وابستگان کو چاہیے کہ ان مظلوم انسانوں کے حقیقی مسائل سے واقعی واقفیت اور عملی تعلق خاطر کی بنیاد پر اسلام کی قولی وعملی شہادت دیں، ان سے حقیقی برادرانہ تعلقات استوار کریں اور اپنے قول وکردار سے خیر خواہی کا حق ادا کرنے کے لیے کمر بستہ ہوجائیں۔ اتنی بڑی آبادی کو حقیقی حل یعنی اسلام سے بے خبر رکھ کر اور دیگر ایجنڈوں پر ان کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کا آخر کیا فائدہ مسلمانوں کو یا خود ان کو مل سکتا ہے؟

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ملک میں صحابہ کرامؓ اور تابعین تشریف لائے تھے۔ انہوں نے مظلوم اور محروم طبقات میں دعوت اور بے لوث خدمت کا راستہ اختیار کیا، ان کو گلے لگا کر اسلامی مساوات، عزت اور بھائی چارہ کا رویہ اپنایا۔ اس کے نتیجے کے طور پر یہ آبادی اسلام کی آغوش میں آتی چلی گئی۔ مسلمانوں کی یہ آبادی ملک کے باہر سے نہیں آئی، بلکہ یہیں کی آبادیوں میں سے مسلسل قبول حق کی وجہ سے ہے۔

آج اس آبادی کے اندر شعور پیدا ہو چکا ہے کہ آزادئ ملک کے بعد مسلمانوں کے خلاف فسادات میں استعمال کر کے ان کا استحصال کیا گیا ہے۔ ماضی کی بہ نسبت آج وہ مسلمانوں سے بہت قریب ہیں۔ ان کے ساتھ ہم دردی اور حقیقی خیر خواہی کا لازمی تقاضا ہے کہ انہیں اسلام سے متعارف کرایا جائے۔ ان کی تنظیموں اور قائدین کے بنائے ہوئے منفی ایجنڈوں سے نہ ان کا بھلا ہوگا نہ مسلمانوں کا۔ اپنے منصبی فریضہ کی ذمہ داری ادا کرنے کے نتیجے میں، ان میں سے سعید روحیں آگے بڑھ کر حق کو اپنائیں گی تو بنیادی مسئلہ حل ہوگا اور دیگر مسائل کے حل کی راہ بھی نکلے گی۔

☆☆☆

محروم طبقات کی اہم شخصیات

جیوتی باپھُلے

(1827-1890)

محروم اور دیگر مظلوم طبقات کے اوپر مظالم اور ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک کے خلاف جن شخصیتوں نے نمایاں کام کیا ان میں جیوتی باپھلے کا نام بہت اہم ہے۔ ان کا تعلق پونہ (مہاراشٹر) سے تھا۔ ان کا خاندان مالی (باغبان) ذات سے تھا۔ ان کے والد گووندراؤ کاشت کار اور پھولوں کے تاجر تھے۔

جیوتی باپھُلے کے نام میں با کے اضافے کا مطلب مراٹھی میں عزت اور سماج میں اونچے مرتبہ کا ہے۔ جیوتی باپھُلے نے مہاراشٹر ہی نہیں، پورے ملک کے دلتوں اور مظلوموں وپس ماندہ طبقات پر اپنی تحریروں، تقریروں اور ایک تحریک کے ذریعہ اثرات ڈالے ہیں۔ ان کے بعد جن قائدین اور دانش وروں نے ان طبقات میں اہم خدمات انجام دی ہیں وہ سب جیوتی باپھُلے سے متاثر ہیں۔ انہوں نے اعلیٰ ذات والوں کے مظالم اور استحصال کے خلاف ستیہ شودھک سماجی تحریک چلائی۔ اس کے ذریعہ وہ لوگوں میں شعور پیدا کرنا چاہتے تھے۔

محروم اور دیگر پس ماندہ اور مظلوم طبقات کے لیے اسکول کی تعلیم بالکل ممنوع تھی۔ خاص طور پر ان کی عورتوں کے لیے تعلیم حاصل کرنے کے بارے میں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ 1824 میں کرسچین مشنریوں کے زیر اہتمام مراٹھی اسکولوں کی ابتدا ہوئی۔

جیوتی با پھُلے 7 سال کی عمر میں مراٹھا اسکول میں داخل کیے گئے، لیکن ایک برہمن نے ان کے والد کو مشورہ دیا کہ تمہارا بیٹا اسکول میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد کاشت کاری کے قابل نہیں رہے گا۔ باپ کو دھوکہ ہوا۔ وہ اصل چال کو سمجھ نہیں سکا۔ اپنے بیٹے کو اسکول سے نکال کر کھیتی باڑی کے کام میں لگا دیا۔ بیٹے نے 13 سال کی عمر تک پھاوڑا اور کدال لے کر والد کے ساتھ کھیتوں میں کام کیا۔ جیوتی با پھُلے نہایت ذہین اور علم کے حصول میں محنتی تھے۔ انہیں اسکول چھوڑنے کا بہت غم تھا۔ وہ پڑھنا چاہتے تھے۔ ان کے والد کے پڑوسی منشی غفار بیگ تھے۔ وہ اردو اور فارسی کے مدرس تھے ایک کرسچین پادری کے تعاون سے غفار بیگ نے پونہ کے انگریز کلکٹر تک رسائی حاصل کر کے 1841 میں پونہ کے اسکاٹش اسکول میں جیوتی با کا داخلہ کرایا، جس کے نتیجہ میں انہوں نے انگریزی میں خاص عبور حاصل کیا۔ اسی وجہ سے انہوں نے دنیا کے فلاسفرس اور مفکرین کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ پھلے نے ایک مسلمان کے اس عظیم احسان کو ہمیشہ یاد رکھا۔

تعلیم حاصل کرنے کے دوران بہت سے واقعات پیش آئے۔ وہ بارہا نسلی امتیاز کا شکار بنے۔ انہیں اس کا بہت صدمہ ہوا۔ ان کے بچپن کے پس منظر نے ان کو مستقبل میں دلتوں اور مظلوموں کے لیے جدوجہد میں رہنمائی کی۔ درج ذیل واقعات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس دور میں دلتوں اور مظلوموں کے ساتھ کس قدر دردناک صورت حال پائی جاتی تھی:

اسکول کے زمانے میں پھلے مسلمانوں کے گھروں کو جاتے اور پانی پیتے۔ گھر کے مرد اور خواتین محبت سے باتیں کرتیں۔ مسلمانوں کے گھروں میں داخلہ آسان تھا۔ لیکن پھلے کسی برہمن طالب علم کے گھر جانے کا تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔ ایک بار پھلے کو برہمن دوست کی شادی میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ وہ اس میں شریک ہوئے اور باراتیوں کے ساتھ چل رہے تھے۔ یکا یک ایک اعلیٰ ذات کے ایک شخص نے پھلے کو پہچان لیا اور آگ بگولا ہو کر شور مچا دیا۔ یہاں تک کہ پھلے کو بارات سے نکل کر گھر واپس لوٹنا پڑا۔ پھلے کو اس کا شدید صدمہ ہوا۔

پھلے ایک ایسے دور میں پیدا ہوئے جب پیشواؤں یعنی برہمنوں کی حکومت ختم

ہوگئی تھی اور انگریزوں کی حکومت کا آغاز 1818 میں ہوا تھا۔ مہاراشٹر میں پونہ کے آس پاس چھوٹے چھوٹے راجا تھے جو انگریزوں کی نگرانی میں کام کرتے تھے۔ پیشواؤں (برہمنوں) کا دورِحکومت تقریباً100 سال تک تھا۔ اس دور میں شودر اور اتی شودر یعنی اچھوت سے بڑھ کر اچھوت طبقات کے حالات بہت خراب تھے۔ عورتوں کا بازار لگتا تھا۔ بااثر جاگیردار اور سردار عورتوں کو خرید کر پیشوا اور ان کے رشتہ داروں کو تحفے کے طور پر دیتے تھے۔ معمولی قصوروں پر بھیانک سزائیں دی جاتی تھیں۔ ان کے لیے ہدایت تھی کہ سڑک کے کنارے چلیں۔ کمر میں جھاڑو اس طرح باندھیں کہ زمین پر چلنے سے پیروں کے نشانات صاف ہوتے جائیں اور گلے میں ہنڈیا لٹکائیں، تاکہ زمین پر نہ تھوکیں۔ کلائی میں کالا دھاگہ باندھیں، تاکہ بہ آسانی پہچان لیے جائیں۔

پھلے نے دلتوں اور مظلوم و پسماندہ طبقہ کی خواتین میں تعلیم کو عام کرنے کا فیصلہ کیا اس زمانے میں عورتیں تو درکنار ان کے مردوں کو بھی تعلیم حاصل کرنے کی قطعاً اجازت نہیں تھی اور نہ ہی کسی طرح کے مواقع ان کے لیے میسر تھے۔ پھلے نے اگست 1848 میں پہلا اسکول عورتوں کے لیے قائم کیا۔ اس کی خوب مخالفت ہوئی۔ کوئی ہندو اسکول کے لیے کرایے پر عمارت دینے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ ایک مسلمان عثمان شیخ نے اپنی عمارت کرایہ پر دی۔ انھوں نے جولائی 1851 میں لڑکیوں کے لیے دوسرا اسکول قائم کیا۔ اس کے بعد مزید دو اسکول لڑکیوں کے لیے قائم کیے۔ ان تمام کوششوں کی زبردست مخالفت کی گئی۔ جیوتی با پھلے کے والد پر مخالفین نے اتنا دباؤ ڈالا کہ انھوں نے اپنے بیٹے اور بہو کو گھر سے باہر نکال دیا۔ لیکن پھلے نے ہمت نہیں ہاری۔ ان کی بیوی ساوتری بائی اسکول کی معلمہ تھیں۔ ایک مسلم خاتون فاطمہ شیخ نے تعلیم حاصل کر کے معلمہ کے فرائض انجام دیئے اور خواتین کی تعلیم کی اس تحریک میں ان کا ساتھ دیا۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی طرف سے کئی رکاوٹیں ایسی کھڑی کر دی گئیں کہ اس کے نتیجے میں اسکول کچھ مدت کے لیے بند کرنا پڑا۔ اس کے بعد دوبارہ اسکول چلنے لگے۔ پھلے، ان کی بیوی اور مسلمان معلمہ نے ہر طرح کی معاشی اور سماجی رکاوٹوں کا مقابلہ کیا۔ جیوتی با پھلے نے مسلمانوں کے اس تعاون کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا اور مسلمانوں کے مشکور و ممنون رہے۔ پھلے کی ان تعلیمی سرگرمیوں سے

متاثر ہو کر برٹش حکومت نے انھیں اعزاز سے نوازا۔ پھلے نے انگریزوں کی تعریف کی ہے کہ ان کی وجہ سے دلتوں پس ماندہ لوگوں اور مظلوموں کو کچھ سہولتیں ملیں اور عورتوں میں تعلیم عام ہوئی۔

پھلے اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی تعلیمات بہت پسند کرتے تھے۔ انہوں نے حضورؐ کی شان میں 'مانو محمدؐ' کے عنوان سے ایک زبردست نظم لکھی۔ اس میں حضرت محمدؐ کی تعریف وتوصیف کی۔ انہیں مسلمانوں سے شکایت تھی کہ مظلوم اور پس ماندہ طبقات کے سلسلے میں مسلمانوں نے اپنا فریضہ ادا نہیں کیا۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے حکومت کی طاقت سے بھی نوازا، لیکن اس سے انہوں نے فائدہ نہیں اٹھایا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ پھلے نے مظلوم اور پس ماندہ طبقات کی فلاح اور بہبود کے لیے تحریک چلائی۔ انہوں نے کتابیں لکھیں۔ ایک تنظیم 'ستیہ شودھک سماج' نی قائم کی۔ اس کی سرگرمیاں زور وشور سے شروع ہوگئیں۔ خاص طور پر مذہب کے نام پر رسوم ورواج کو پاک صاف کرنا، شادی بیاہ میں پنڈتوں کو نہ بلانا، راست خالق کی عبادت کرنا۔ صاف ستھری زندگی بسر کرنا۔ پھلے نے کچھ نئے مذہبی تصورات پیش کر کے دلتوں اور مظلوم طبقات کو ہندو مذہب سے ہٹانے کی کوشش کی۔ وہ توحید کے قائل تھے، اسلام اور عیسائیت کی انہوں نے کھل کر تعریف کی۔ خود کوئی مذہب قبول نہیں کیا۔ ان کی بعض کتابیں آسان مکالمات کی شکل میں بہت ہی دل چسپ اور موثر انداز میں موجود ہیں۔ پھلے نے لاکھوں انسانوں کو متاثر کیا۔

انہوں نے پوری عمر جدوجہد کی کہ مذہب کے نام پر مظلوم اور پس ماندہ طبقات پر مظالم کا سلسلہ بند ہو، تعلیم عام ہو، عورتوں سے اچھا سلوک کیا جائے، تمام انسانوں کے حقوق ادا کیے جائیں۔ طویل جدوجہد کرتے ہوئے ان کا آخری وقت قریب آچکا تھا۔ نومبر 1890 میں اپنے تمام ساتھیوں کو جمع کر کے انھوں نے نصیحت کی کہ ستیہ شودھک سماج کی تحریک کو کامیابی سے چلائیں۔ مشکلات اور رکاوٹوں کا ہمت سے سامنا کرتے رہیں۔ اس تحریک کی وجہ سے پھلے کی بھرپور مخالفت کی گئی تھی لیکن انھوں نے ہمت اور حوصلے سے کام لے کر اس کو جاری رکھا تھا۔ 28/نومبر 1890 کو پونہ میں پھلے انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال کی خبر جلد ہی پھیل گئی۔ پھلے کی زندگی اور تعلیمی وسماجی مشن کے گہرے اثرات عوام وخواص

پر پڑے تھے۔انہوں نے اپنی پوری زندگی اور سرمایہ عوام کے لئے وقف کردیا تھا۔

(یہ مواد جناب سید شاہ غازی الدین (مرحوم) کی کتاب مہاتما جیوتی با پھلی حیات اور کارنامے سے ماخوذ ہے۔ اشاعت 2005، پتہ : پھلے شاہو امبیڈ کر وچار منچ، 209۔شنی وار پیٹھ، شولاپور۔ 413002 (مہاراشٹر)

☆☆☆

ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر

(1891-1956)

ان کا پورا نام باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر ہے۔ وہ دلت اور مظلوم طبقات کے عظیم رہنما کی حیثیت سے معروف ہیں۔ بھارت کے دستور کی تدوین میں ان کا رول قائدانہ رہا ہے اور یہ ان کا عظیم کارنامہ ہے کہ ملک کو ایک بہترین دستور دیا۔ امریکہ اور لندن سے انہوں نے معاشیات ، سماجیات ، فائنانس اور دیگر علوم میں بڑی اونچی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ وہ قانون میں بھی اعلیٰ ڈگری رکھتے تھے۔ ان علوم پر مبنی کئی اہم کتابیں انہوں نے لکھیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر کا مشن محروم اور مظلوم طبقات کو اوپر اٹھانا، انہیں ذات پات کے نظام، اونچ نیچ، چھوت چھات اور غلامی سے نجات دلانا اور ان کے حقوق دلوانا تھا۔ ان کی کوشش آخر وقت تک یہ تھی کہ ان طبقات کو عزت انسانی برابری اور بھائی چارگی و سماجی انصاف حاصل ہو۔ ڈاکٹر امبیڈکر خود پوری زندگی اعلیٰ ذاتوں کے ظلم وستم اور تحقیر آمیز رویے کا شکار رہے۔ وہ سوچتے تھے کہ اتنی بڑی علمی ڈگریاں اور اعلیٰ تعلیم رکھتے ہوئے ان کے ساتھ ذلت آمیز رویہ اور شدید اذیت پہنچانے والا طرزِ عمل اختیار کیا جارہا ہے تو عام دلتوں اور مظلوموں کے ساتھ گاؤں، شہروں اور دور دراز دیہاتوں میں کیا حال ہوگا۔ کئی مرتبہ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئے۔ وہ درد اور تکلیف سہتے رہے۔ انگلستان کے وزیراعظم اور دوسرے سیاست دانوں سے ملاقات کرنے والا، اپنے موقف کو جرأت کے ساتھ پیش

کرنے والا فرد اپنے ہی ہم وطنوں کے ہاتھوں ناقابل برداشت اذیتیں سہتا رہا اور زندگی کے آخری وقت تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کے درد کو سمجھنے کے لیے ان کا یہ جملہ کافی ہے: ''میں ہندو پیدا ہوا جو میرے بس میں نہیں تھا، لیکن میں ہندو نہیں مروں گا، یہ میرے بس میں ہے''۔ چنانچہ انہوں نے اکتوبر 1956 میں مذہب تبدیل کر کے بودھ دھرم قبول کرلیا تھا۔ دسمبر 1956 میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے اپنے پیروؤں کی رہ نمائی کی تھی کہ وہ اپنی حالت بدلنے کے لیے مذہب تبدیل کریں۔ اس کے لیے انھوں نے تین مذاہب کی نشان دہی بھی کی تھی: اسلام، عیسائیت اور سکھ دھرم۔ لیکن خود اسلام قبول نہیں کیا۔ اس کی وجوہ پچھلے صفحات میں بیان کی جاچکی ہیں۔

اسلام کے بنیادی مآخذ قرآن وسنت اور سیرت رسولؐ کا راست مطالعہ بھی وہ نہیں کر سکے تھے۔ انہوں نے قرآن کو اب تک نہ پڑھنے پر افسوس جتایا تھا۔

ڈاکٹر امبیڈکر 14/اپریل 1891 میں پیدا ہوئے۔ جب کہ 1890 میں مہاتما جیوتی با پھلے کا انتقال ہوا تھا۔ وہ پھلے کو اپنا روحانی گرو مانتے تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر اپنے والدین کی چودھویں اولاد تھے۔ بھیم راؤ ان کا نام رکھا گیا۔ مہاراشٹر کی مہار ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ کسی قدیم دور میں مہار مہاراشٹر کے حکم راں تھے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی ڈاکٹر امبیڈکر کو نسلی امتیاز کا شکار ہونا پڑا۔ وہ کئی تلخ تجربات سے گذرے۔ ان کی طبیعت بہت حساس تھی۔ ان کو اسکول میں اعلیٰ ذات کے طلبہ سے الگ بیٹھنے کے لیے اپنی چٹائی لے جانا پڑتا تھا۔ دلت طلبہ کے لیے پانی پینے کا الگ انتظام تھا۔ اساتذہ ان کی کتابوں اور کاپیوں کو نہیں چھوتے تھے۔ بھیم راؤ کو جلد ہی احساس ہوا کہ وہ اور ان کا گھرانہ اچھوت ہے۔ زمانۂ طالب علمی سے ہی ان کو مطالعۂ کتب کا بے حد شوق تھا۔ 1907 میں انہوں نے میٹرک پاس کیا، پھر بی اے اور ایم اے سے فارغ ہو کر امریکہ اور لندن اعلیٰ تعلیم کے لیے چلے گئے۔ وہ وہاں کی مشہور یونی ورسٹیوں سے ڈاکٹر آف فلاسفی (PhD) اور بار ایٹ لا کی ڈگریاں حاصل کر کے لوٹے۔ ڈاکٹر امبیڈکر ہمیشہ مالی پریشانیوں سے دوچار رہے۔ لندن میں اپنی تعلیم کے دوران گھریلو حالات کے بہت خراب ہونے پر ان

کو گھر واپس لوٹنا پڑا۔ مہاراشٹر کے جنوب میں بیگام کرناٹک سے قریب ایک شہر کولہاپور ہے۔ ریاست کولہاپور کے راجا شاہو مہاراج (1922-1827) تھے۔ یہ شیواجی مہاراج کے خاندان سے تھے۔ دلتوں، مظلوموں اور پس ماندہ طبقات اور مسلمانوں سے بے حد محبت کرتے تھے۔ 1902 میں انھوں نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ مسلمانوں اور غیر برہمن طبقات کو ملازمتوں میں 50 فیصد ریزرویشن دیا تھا۔ شاہو مہاراج نے ایک موقع پر ڈاکٹر امبیڈکر کو گلے لگاتے ہوئے کہا تھا: اب میں بے فکر ہو گیا ہوں، کیوں کہ دلتوں کو ایک لائق رہنما مل گیا ہے۔'' ڈاکٹر امبیڈکر جولائی 1920 میں دوبارہ لندن گئے اور اپنی تعلیم مکمل کر کے اپریل 1923 میں واپس ہوئے۔ لندن سے ممبئی تک کا واپسی کا سفر بہت تکلیف دہ تھا۔ پیسوں کی کمی کی وجہ سے سب سے سستا ذریعہ یعنی مال بردار بحری جہاز میں سوار ہو کر لندن سے کولمبو اور کولمبو سے مدراس (چنئی) اور پھر وہاں سے بذریعہ ٹرین ممبئی آئے۔ دادر اسٹیشن سے پیدل اپنے گھر پہنچے۔

ممبئی میں قیام کے بعد ڈاکٹر امبیڈکر محروم اور مظلوم طبقات کے مسائل کو حل کرنے کے لیے عملی اقدامات کا آغاز کیا۔ اس سے قبل انہوں نے اخبار کا اجرا کیا۔ ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ مضامین لکھے، لیکن جولائی 1924 میں، پس ماندہ اور مظلوم طبقات کو اونچا اٹھانے اور ان کی فلاح وبہبود کے لیے ایک تنظیم قائم کی۔ اس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر امبیڈکر کا نام تجویز کیا گیا۔ اس میں اعلیٰ ذات کے بعض حضرات کو بھی شامل کیا گیا تھا۔ گاندھی جی اپنے طور پر اس طرح کے مقاصد کے لیے کام کر رہے تھے۔ اس زمانے میں دلتوں کے اسلام قبول کرنے کی باتیں بھی پھیلی ہوئی تھیں۔

اپنی خاندانی زندگی میں ڈاکٹر امبیڈکر کو کئی صدمے سہنے پڑے۔ ان کے تین خوب صورت لڑکے اور ایک لڑکی بچپن ہی میں وفات پا گئے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے ذات پات کے نظام اور چھوت چھات کے خاتمے کے لیے ایک بڑا عملی قدم اٹھایا۔ ضلع رائے گڑھ کے قریب ایک قصبہ مہاڈ میں ایک تالاب 'چوب دار تالاب' کے نام سے ہے۔ نگر پالیکا نے ایک قرارداد کے ذریعہ اس کا پانی سب

کے لیے کھلا رکھا تھا، مگر دلتوں کو اونچی ذات والوں کے دباؤ کی وجہ سے تالاب سے پانی لینے کی ہمت نہیں تھی۔ڈاکٹر امبیڈکر نے مہاڈ میں ایک کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کانفرس کے لیے کوئی جگہ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ایک مسلمان نے اپنی جگہ میں کانفرنس کے انعقاد کی اجازت دی۔ اس میں 3 ہزار دلت جمع ہوئے۔ دلتوں نے اپنے ساتھ ہونے والے غیر انسانی سلوک اور دردناک حالات بیان کیے۔ دوسرے دن فیصلہ ہوا کہ تالاب پہنچ کر ڈاکٹر امبیڈکر اوران کے ساتھی اپنے ہاتھوں سے پانی پیش کریں گے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا انقلابی قدم تھا۔اونچی ذات کے لوگوں نے دلتوں کو گھیر لیا اوران پر لاٹھیاں برسا کر انھیں زخمی کر دیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر زخمیوں کا علاج کرانے کے بعد ممبئ روانہ ہوئے۔ پورے مہاراشٹر میں اس واقعہ کا نوٹس لیا گیا۔اخبارات اونچی ذات والوں کے تھے۔ اس لیے اس واقعہ پر سخت تنقید کی۔ ڈاکٹر امبیڈکر نے بروقت جواب دیا۔اس واقعہ کے بعد دلتوں اور مظلوموں میں ایک زبردست جوش پیدا ہوگیا۔انہوں نے اونچی ذات والوں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔اس طرح 1927 میں ایک ستیہ گرہ کا پلان بنایا۔ دس ہزار افراد مہاڈ میں جمع ہوئے۔ اونچی ذات والوں نے اسے ناکام کرنے کی کوشش کی۔مسلمانوں نے لوگوں کے بیٹھنے کے لیے اپنا کھیت وغیرہ دے کر تعاون کیا۔اس میں تقاریر ہوئیں اور قراردادیں منظور کی گئیں۔ عدالتی امتناعی احکام کی بنا پر ستیہ گرہ کا پروگرام ملتوی کرنا پڑا۔ چوب دار تالاب پر پانی پینا اور منواسمرتی کا جلایا جانا، یہ دونوں واقعات دلت تحریک کی تاریخ کا سنگ میل ہیں۔ ایک اہم مسئلہ محروم اور مظلوم طبقات کے مندروں میں داخلے کا تھا۔اس میں ڈاکٹر امبیڈکر کامیاب نہیں ہوسکے۔

ایک اہم واقعہ اکتوبر 1928 میں پیش آیا۔سرسائمن کی قیادت میں انگریز اراکین پر مشتمل سائمن کمیشن ہندوستان پہنچا۔پس ماندہ طبقات کو کیا مراعات دی جائیں؟ بالخصوص علاحدہ حلقہ ہائے انتخاب کا تعین یہ سوال کمیشن کے سامنے تھا۔تمام سیاسی پارٹیوں نے اس کی مخالفت کی، لیکن ڈاکٹر امبیڈکر نے اس موقع کو غنیمت جانا اور محروم اور مظلوم طبقات کی موثر نمائندگی کی۔ اس بات پر بھی ان کی بہت مخالفت کی گئی اور اعتراضات کیے

گئے۔ڈاکٹرامبیڈکر نے ان سب کا معقول جواب دیا۔پہلی مرتبہ دلتوں کی نمائندگی اعلیٰ سطح پر کی گئی تھی۔اس لیے یہ بھی ایک تاریخ بن گئی۔ڈاکٹرامبیڈکرملکی سطح پر دلتوں کے رہ نما بن گئے۔ ملک میں آزادی کی لڑائی گاندھی جی کی قیادت میں جاری تھی،مگر ڈاکٹرامبیڈکر کا موقف یہ تھا کہ انگریزوں کی غلامی سے آزادی ضروری ہے،لیکن دلتوں کی سماجی آزادی اوران کے حقوق کاتحفظ اس سے زیادہ ضروری ہے۔دراصل وہ اقتدار کی منتقلی سے زیادہ نظام کی تبدیلی کے خواہاں تھے۔

اگست 1930 میں ڈاکٹر امبیڈکر نے محروم،مظلوم اورپس ماندہ طبقات کی ایک کل ہندکانفرنس منعقد کر کے ملکی سطح پران کے مسائل کواجاگر کیا۔دوسری گول میز کانفرنس 1931 میں لندن میں منعقد کی گئی۔ اس میں گاندھی جی نے بھی شرکت کی۔ کانفرنس کی صدارت وزیراعظم برطانیہ نے کی۔ڈاکٹرامبیڈکر نے موثر انداز میں محروم، مظلوم اورپس ماندہ طبقات کی نمائندگی کی۔ ان کے مسائل اورحل پیش کیے، ان کے موجودہ حالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔تجاویز بھی پیش کیں۔گاندھی جی اورامبیڈکر کے نقطۂ نظر میں بہت فرق تھا۔17/اگست 1931 کو برطانوی وزیراعظم نے اپنے فیصلہ کا اعلان کیا، جوکمیونل ایوارڈ کے نام سے مشہور ہوا۔اس میں محروم اورمظلوم طبقات کے بہت سے مطالبات منظور ہوئے اور کچھ نہیں بھی کیے گئے۔گاندھی جی نے اس کے خلاف یروڈاجیل پونہ میں مرن برت کا آغاز کردیا۔ پورے ملک میں ڈاکٹرامبیڈکر پرزبردست تنقیدیں ہونے لگیں۔گاندھی جی کی زندگی بچانے کی پوری ذمہ داری امبیڈکر پرڈال دی گئی۔گاندھی جی سے ملاقات کے لیے اصرار کیاجانے لگا۔ڈاکٹرامبیڈکر سے کانگریس کے بڑے رہ نمااور دیگر سیاسی شخصیتوں نے ملاقات کرکے انہیں آمادہ کرلیا کہ وہ گاندھی جی سے ملاقات کریں،تاکہ ایک سمجھوتہ کے تحت کوئی درمیانی راہ نکالی جائے۔ایک معاہدہ تیارکیا گیا جو پونہ پیکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔دلت تحریکیں اس معاہدے (پونہ پیکٹ) کوایک سیاہ باب تصور کرتی ہیں۔

اپنے پیروؤں کوانھوں نے مشورہ دیا کہ وہ جس مذہب کواپنے لیے بہتر سمجھتے ہیں

اسے قبول کرلیں۔ تبدیلیِ مذہب کا فیصلہ ان کا اپنا ہونا چاہیے۔ اگر کوئی اس مشورے کو قبول نہیں کرنا چاہتا تو انہیں کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ انہوں نے کہا تھا کہ بہر حال مجھے اطمینان رہے گا کہ میں نے اپنی ذمہ داری پوری کی ہے۔

ڈاکٹر امبیڈکر اپنی زندگی کے آخری چار پانچ سال پہلے سے بہت زیادہ مصروف رہے۔ مختلف بیماریوں کی وجہ سے ان کی صحت بہت متاثر ہوگئی تھی۔ 14/اکتوبر 1956 ناگ پور میں انہوں نے 3 تا4لاکھ پس ماندہ طبقات کے افراد کے ساتھ بودھ مت قبول کرلیا۔ اخبارات میں اس پر سخت تنقیدیں اور تبصرے شائع ہوئے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی صحت دن بہ دن خراب ہوتی چلی گئی۔ 6 دسمبر 1956 کو پراسرار حالات میں ان کی وفات اپنے گھر دہلی میں ہوئی۔

(یہ مواد جناب سید شاہ غازی الدین کی کتاب ڈاکٹر باباصاحب بھیم راؤ امبیڈکر حیات اور کارنامے کا خلاصہ ہے۔
سن اشاعت 2007، 209,Shaniwar peth-413002(Maharashtra))

☆☆☆

شاہومہاراج
(1874-1922)

مہاراشٹر میں محروم اور مظلوم وپس ماندہ طبقات کو انسانی حقوق دلانے، ذات پات کے نظام اور چھوت چھات کے ناروا امتیازات کے خاتمے کے لیے جدوجہد کرنے والوں میں شاہومہاراج کا نام بہت نمایاں ہے۔ جیوتی با پھلے، ڈاکٹر امبیڈکر اور شاہومہاراج یہ تین اہم شخصیتیں ایسی ہیں جن کی جدوجہد کے اثرات صرف ریاست مہاراشٹر پر ہی نہیں، بلکہ پورے ملک پر پڑے۔ شاہومہاراج کولہاپور ریاست کے حکمراں تھے۔ وہ راجہ شیواجی کے وارثوں میں سے تھے۔ یہ ریاست انگریزوں کی سرپرستی میں قائم تھی۔ اقلیتوں بالخصوص مسلمانوں میں وہ بے حد ہردل عزیز تھے۔ انہوں نے بہت سے انقلابی اقدامات کیے جن کے گہرے اثرات اور فیض کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ ایک مثال پیش کی جا رہی ہے۔ شاہومہاراج 1902 میں لندن میں تھے۔ انہوں نے کولہاپور گزٹ میں ایک شاہی فرمان جاری کیا کہ تمام ملازمتوں میں 50 فی صد غیر برہمن (بہوجن) بہ شمول مسلمان افراد کے لیے ریزرویشن دیا جائے۔ آج سے 116 سال قبل ایسا کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ انہوں نے ریزرویشن کی اس پالیسی کے ذریعے ملازمتوں میں اعلیٰ ذات والوں کی اجارہ داری ختم کر کے سماج کے سبھی طبقات کو عدل وانصاف کے ساتھ آگے بڑھانے کا کارنامہ انجام دیا۔

شاہومہاراج کا نام یشونت تھا۔ 26 جولائی 1874 کو اپا صاحب گھاٹگے کے گھر

پیدا ہوئے۔ان کے والدابا صاحب ایک گاؤں کے جا گیر دار تھے۔ ان کا گھرانہ راج گھرانے سے قریبی رشتہ رکھتا تھا۔ راج گھرانے کی بیوہ مہارانیوں نے یشونت کو متبنیٰ (گودلیا) بنالیا اور اس کا نام شاہو رکھا۔ 10 سال کی عمر میں یہ رسم انجام پائی اور شاہوشاہی گھرانے سے وابستہ ہوگئے۔ وہ راجکوٹ (گجرات) کے ایک کالج میں تعلیم کے لیے داخل ہوئے،لیکن چند ہی ماہ میں والدابا صاحب کے شدید علیل ہونے کی خبرپا کر کولہاپور روانہ ہوئے۔ یہاں پہنچنے تک والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کی عمر 12 سال تھی۔ اس کے بعد وہ راج کوٹ میں 1889 تک تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد 1889 سے 1892 کرناٹک کے شہر دھارواڑ میں مزید تعلیم حاصل کی۔

شاہومہاراج کی تخت نشینی کے وقت پونہ کے مشہور سماجی مصلح جیوتی با پھلے کے انتقال کو صرف 5—6 سال گزرے تھے۔اپریل 1894 میں کولہاپور کے راجا کی حیثیت سے(۲۵) سال کی عمر میں شاہومہاراج کی تخت نشینی ہوئی۔اس کے کچھ عرصے بعد انہوں نے پونہ کا سفر کیا۔ان کا زبردست استقبال ہوا۔ پونہ میں انہیں استقبالیہ دیا گیا۔انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ وہ صرف کولہاپور کے عوام کی فلاح وبہبود کے لیے نہیں، بلکہ پورے مہاراشٹر کے عوام کے لیے کام کریں گے۔ اس کے بعد وہ عوامی مسائل پر خاص توجہ دینے لگے۔انھوں نے عوام سے راست گھل مل کر ان کی مشکلات کو سمجھنے اور حل کرنے کی کوشش کی۔ وہ غریب لوگوں سے چھوٹے گھروں بلکہ جھونپڑیوں میں جا کر ملتے ،ان کے ہاں چائے پیتے۔ ایک بار تو قبائلیوں کے معمولی سے گھروں میں جا کر ان سے ملاقات اور بات چیت کی۔ دربار کے انتظامی اور حکومتی شعبوں سے لے کر عوامی زندگی کے تمام شعبوں میں خرابیوں کو دور کر کے اصلاحی اور انقلابی اقدامات کا آغاز کر دیا۔تعلیم وغیرہ پر خاص توجہ دی۔محروم اور پس ماندہ طبقات کے طلبہ اور طالبات کے لیے اسکالرشپ جاری کیں۔وہ مختلف طریقوں سے ان کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ 1917 میں ایک اعلامیہ کے ذریعہ انھوں نے 14 سال کی عمر تک کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ابتدائی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔اس زمانے میں ایسے انقلابی فیصلے کا کوئی تصور بھی نہیں

کر سکتا تھا، کیوں کہ تعلیم حاصل کرنا صرف اعلیٰ ذات والوں کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ والدین اور سر پرستوں کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ اس قانون کی پابندی کریں، بہ صورت دیگر ان پر جرمانہ عائد کیا جائے گا۔ زراعت، صنعت وحرفت، معاشی اصلاحات اور عوامی زندگی میں فلاح وبہبود کی اسکیمیں، ان سب محاذوں پر انھوں نے بہ یک وقت یکساں توجہ دی۔ تمام پس ماندہ طبقات کے حقوق کی بحالی اور حفاظت کے لیے وہ آخر وقت تک کوشش کرتے رہے۔ دربار کے اندر اونچی ذات والوں کی اجارہ داری کو بہ تدریج ختم کر کے تمام طبقات کے حقوق کی حفاظت کے لیے وہ جد و جہد کرتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اونچی ذات والوں نے زبردست محاذ کھول دیا اور ان کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ ان کی ذاتی زندگی کو نشانہ بنایا۔ اخبارات میں ان کے خلاف غلط پروپگنڈے کیے گئے، الزامات لگائے گئے اور سازشیں کی گئیں۔ انہیں کبھی چین سے کام کرنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ شاہو مہاراج ایک حساس دل رکھتے تھے۔ ان کے خلاف کی جانے والی سازشوں اور پست حرکات سے بہت اذیت ہوتی تھی لیکن وہ صبر، ہمت اور حوصلے سے برابر اپنے مشن کی تکمیل میں لگے رہے۔ انھوں نے کبھی اپنے مخالفین سے انتقام لینے کی کارروائی نہیں کی، بلکہ عفو و درگزر سے کام لیا اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔

1912 میں شاہو مہاراج نے محروم اور مظلوم و پس ماندہ طبقات کے معاشی سدھار کے لیے کولہا پور میں کوآپریٹیو موومنٹ شروع کرائی، کولہا پور کوآپریٹیو بینک لمیٹیڈ کی بنیاد رکھی گئی اور ان اداروں کی نگرانی کے لیے رجسٹرار کا تقرر بھی کیا گیا۔

مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشی پس ماندگی دور کرنے کے لیے شاہو مہاراج نے گہری دل چسپی لیتے ہوئے تعلیمی کمیٹی تشکیل دی۔ اس کمیٹی کے صدر وہ خود تھے۔ انہوں نے مختلف طبقات کے طلبہ کے لیے بورڈنگ ہاؤس کی تحریک چلائی، چناں چہ مسلم طلبہ کے لیے بھی ایک بورڈنگ ہاؤس بنایا۔ انھوں نے ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں تقریریں کر کے لوگوں میں بیداری پیدا کی۔ کئی مقامات پر مساجد کی تعمیر کے لیے جگہ فراہم کی اور فنڈ جاری کیے۔ ان کا ایک عظیم کارنامہ مراٹھی ترجمۂ قرآن کے لیے دل چسپی لینا اور 25 ہزار روپیوں کا فنڈ

جاری کرنا تھا۔اس زمانے کے لحاظ سے25ہزار روپے بہت بڑی رقم تھی،ترجمہ کے کام کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی اور اس کے بعد اس کی طباعت کے لیے معقول انتظام کیا۔طباعت کا کام شروع ہوا،لیکن شاہو مہاراج کی وفات کی وجہ سے کام نامکمل رہ گیا۔

شاہو مہاراج نے کولہاپور میں 1906 میں کنگ ایڈورڈ محمڈن ایجوکیشن سوسائٹی قائم کی۔اس کے زیر اہتمام 20 کمروں پر مشتمل مسلم طلبہ کے لیے ایک بورڈ نگ ہاؤس تعمیر کرایا۔اس کے لیے شہر کولہاپور کے قلب میں25ہزار مربع فٹ وسیع پلاٹ دیا۔بورڈنگ ہاؤس کے اخراجات کے لیے آمدنی کا ذریعہ بھی بنایا۔اس کے علاوہ سالانہ گرانٹ بھی منظور کی۔اس سے کولہاپور کے اطراف واکناف سے اسکول اور کالج کی تعلیم کے لیے آنے والے مسلم طلبہ کے لیے بے حد سہولت ہوگئی۔ایک اہم فیصلہ انھوں نے اوقاف کے سلسلے میں کیا کہ اوقاف کی آمدنی سے ضروری اخراجات کے بعد بچی ہوئی رقم لازماً مسلم طلبہ کی تعلیم پر خرچ کی جائے۔

شاہو مہاراج نے مسلم بورڈنگ ہاؤس کے علاوہ مختلف طبقات کے طلبہ اور طالبات کی تعلیم کے میدان میں ترقی اور حوصلہ افزائی کے لیے جین بورڈنگ ہاؤس، لنگایت بورڈنگ ہاؤس، سناروں کی بورڈنگ ہاؤس اور شمپی سماج کی بورڈنگ ہاؤس وغیرہ قائم کیے، یہاں تک کہ اونچی ذات کے مستحق طلبہ اور طالبات کے لیے بھی انہوں نے اسی طرح کے ادارے قائم کیے، تا کہ وہ بھی تعلیم میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔

شاہو مہاراج مسلسل کام کرتے رہے،جس کے نتیجے میں ان کی صحت بہت متاثر ہوتی رہی وہ شوگر کے مریض تھے،اس کے علاوہ انھیں دوسری بیماریاں بھی لاحق تھیں۔6 مئی 1922 کی صبح 48 سال کی عمر میں وہ ممبئی میں انتقال کر گئے۔نعش وہاں سے کولہاپور لائی گئی جہاں ان کی آخری رسومات ادا کی گئیں۔

(یہ مواد جناب سید شاہ غازی الدین (مرحوم) کی کتاب 'راج رشی شاہو مہاراج۔حیات اور کارنامے' سے ماخوذ ہے۔شنی وار پیٹھ شولا پور،سن اشاعت 2009)

☆☆☆

راماسوامی نائیکر پیری یار

(1879-1973)

ای ،وی راماسوامی نائیکر کاتعلق ایردوڈ (تمل ناڈو) سے تھا۔ انہیں عزت واحترام کی بنا پر پری یار کیا جا تا تھا،جس کے معنی ' بزرگ بھائی ' کے ہوتے ہیں۔عوام میں وہ اس نام سے مقبول تھے۔ 19 ستمبر 1879 کوان کی پیدائش ہوئی۔وہ ایک ہندو مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ان کے والدین مذہب کے رسم ورواج کی پوری پابندی کرتے تھے۔

6سال کی عمر میں پری یار اسکول بھیجے گئے۔تعلیم میں ان کی دل چسپی کم ہی تھی۔ اپنے بچپن کے بارے میں وہ بتاتے ہیں: ''مجھے بچپن ہی سے ذات پات اور مذہب پر کسی طرح کا یقین نہیں تھا۔ یہ بات، کیوں کب اور کیسے پیدا ہوئی، یہ کوئی نہیں جانتا۔ چھ سال کی عمر میں انھیں اسکول میں داخل کر دیا گیا، جو ایروڈ سے تھوڑے فاصلے پر تھا۔ اسکول کے قرب وجوار میں چٹیار ذات سے تعلق رکھنے والوں کے کچھ گھر تھے۔ وہ تیل کا کاروبار کرتے تھے اور کچھ لوگ اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھ کر بانس کی ٹوکریاں بناتے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں پر مسلمان بھی آباد تھے۔ چٹیار (تیلی) ٹوکریاں بنانے والے اور مسلمان مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے گھر کوئی دوسری ذات سے تعلق رکھنے والا کھانا کھانا تو درکنار پانی تک نہیں پیتا تھا۔ مجھے اسکول روانہ کرنے سے پہلے سختی سے تاکید کی گئی تھی کہ ان کے ساتھ کسی قسم کا دوستانہ تعلق نہ رکھا جائے۔ ان کے گھروں کا کھانا اور پانی پینے تک کی سخت

ممانعت کی گئی تھی'' (پری یا۔نئی جہتوں کا نقیب، صفحہ 13)

پیری یار بچپن ہی سے ان سب پابندیوں کے خلاف تھے۔ وہ اسکول میں مسلمان بچوں کے ساتھ ملتے جلتے، ان کے گھروں میں پانی پیتے اور کھانا کھاتے۔ جب ان کے گھر والوں کو اس کا پتہ چلا تو انہوں نے ان کا اسکول جانا بند کرا دیا۔

پیری یار نے جوانی میں ہی نشہ بندی اور سماجی و مذہبی اصلاحات کی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ بیوی نے ان کا بھر پور ساتھ دیا۔ انہیں جیل بھی جانا پڑا، لیکن وہ پیچھے نہیں ہٹے۔ انھوں نے عوام کی خدمت، سماجی اصلاحات اور عوامی مسائل کے حل کے لیے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی۔ کانگریس کے دو اہم قائدین ڈاکٹر نائیڈو اور راج گوپال آچاریہ نے پیری یار سے ملاقات بھی کی تھی۔ گاندھی جی نے ایک بار ان کے گھر قیام کیا تھا۔ پیری یار کے اندر احساس ذمہ داری اور قربانی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ میونسپلٹی کے چیئرمین اور اعزازی جج تھے، 29 کمیٹیوں کے ممبر تھے۔ انہوں نے ان سب سے استعفیٰ دے دیا۔ تحریک عدم تعاون کی خاطر سالانہ 20 ہزار روپے کے کاروبار کو بند کر دیا۔ سول نافرمانی کی تحریک میں گھریلو دستاویز جلائے، جس میں انہیں 50 لاکھ کا نقصان اٹھانا پڑا۔ نشہ بندی کی تحریک کے لیے اپنے ناریل کے 500 درخت کٹوا دیے، جس سے سالانہ 20 ہزار روپے کی آمدنی بند ہو گئی۔ ان درختوں سے نشہ آور مشروب نکالا جاتا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ گاندھی جی کی قیادت میں کانگریس محروم اور پس ماندہ طبقوں کے حقوق کی بحالی اور ذات پات کے نظام کا خاتمہ کرے گی، لیکن بہت جلد ان کو اندازہ ہو گیا کہ کانگریس کی قیادت ان کاموں کے لیے مخلص نہیں ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کانگریس کو چھوڑ دیا۔

پیری یار کے زمانہ میں محروم اور پس ماندہ طبقات کے حالات بہت خراب تھے۔ ان طبقات کے افراد کو مندروں میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اگرچہ اکثریت دلتوں اور پس ماندہ طبقات کی تھی۔ انہیں مندروں میں جانے اور اسکول میں داخلے کی اجازت نہیں تھی۔ راستہ میں انہیں اونچی ذات سے دور ہٹ کر چلنا

پڑتا تھا۔سرکاری محکموں میں ملازمتوں کے لیے وہ امتحانات بھی نہیں دے سکتے تھے۔ سرکاری تالابوں اور کنوؤں سے پانی لینے کی انھیں ممانعت تھی۔دیگر کم ذاتوں کی خواتین کی طرح ان کی عورتیں بھی ساڑھی کے ساتھ بلاوز نہیں پہن سکتی تھیں کیوں کہ یہ استحقاق صرف اعلیٰ ذات کی عورتوں کو حاصل تھا ’’پیری یار نئی جہتوں کا نقیب‘‘ ص30

پیری یار اونچی ذاتوں کی مذہبی کتب اور نچلی ذاتوں کے تئیں ان کے رویے سے واقف تھے۔انہوں نے ایک تحریک Self Respect Movement اور ایک مشہور ستیہ گرہ ’’وائی کوم مندر‘‘ تحریک چلائی۔دراصل اس مندر کے راستے سے کتے، بلیاں اور دوسرے جانور وغیرہ گذرتے تھے،لیکن دلتوں کو اس راستے سے گزرنے کی اجازت نہیں تھی۔پری یار اس تحریک میں شامل ہو کر محروم اور مظلوم و پس ماندہ افراد کو اس مندر کے راستے پر سے گذرنے کا حق دلانا چاہتے تھے۔انہیں اس سلسلے میں جیل جانا پڑا۔بعد میں محروم اور پس ماندہ افراد کو یہ حق ملا۔

پیری یار نے خواتین کے سماجی حالات میں اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔اس دور میں خواتین کو مذہبی بنیادوں پر ظلم وستم کا شکار بنا دیا گیا تھا۔مثلاً بچپن کی شادی، بیوہ کی شادی نہ ہونا۔عورتوں کی تعلیم،عورتوں کا شوہر کی وفات پرستی ہوجانا،عورتوں کو جائیداد سے محروم رکھنا وغیرہ،عورتوں کو دلت قرار دے کر تمام حقوق سے محروم کرنا اور ان کا استحصال کرنا وغیرہ۔پری یار نے جب Self Respect Movement چلائی تو عورتوں کے حقوق کی بحالی اور ظلم واستحصال سے ان کو بچانا بھی تحریک کے مقاصد میں شامل رکھا۔اس کے ساتھ انہوں نے عملاً بعض تعلیمی کام عورتوں کے لیے کیے۔مثلاً انھوں نے ان کے لیے نرسنگ اسکول، پالی ٹیکنک اور ایک انجینئرنگ کالج قائم کیا۔عورتوں کو پولیس اور ملٹری سروس میں لینے کی پرزور وکالت کی۔انھوں نے 1937 میں عورتوں کے حقوق کا بل پاس کرایا۔یہ ان کی بڑی کامیابی تھی۔

اسلام کے متعلق پیری یار کے خیالات بہت اہم اور قابل قدر ہیں۔جس زمانے میں انہوں نے یہ خیالات پیش کیے اس کا تصور کرنا بھی بہت مشکل تھا۔اسلام کے متعلق ان کا مطالعہ کتنا تھا اور انہوں نے بنیادی ماخذ سے اسلام کو کتنا سمجھنے کی

کوشش کی، اس کا تو اندازہ نہیں ہے، لیکن وہ بڑی جرأت کے ساتھ عوامی جلسوں میں اسلام کے تعلق سے مثبت رائے ظاہر کرتے تھے۔ وہ اسلام کے تصورِ خدا، تصورِ انسان اور مساوات کی بے حد قدر کرتے تھے۔ اگرچہ پیری یار کو منکر خدا اور منکر مذہب مشہور کر دیا گیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اسلام کے تصورِ خدا کی ستائش کرتے اور پیغمبر اسلامؐ سے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے تھے۔ انہوں نے باقاعدہ دلتوں کو قبولِ اسلام کے لیے دعوت دی۔ اسلام اور پیغمبر اسلامؐ کی خوبیاں گنوائیں۔ مختلف مواقع پر انہوں نے اسلام کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے۔

20 دسمبر 1953 کو مدراس (چنئی) میں سیرت النبیؐ کے ایک جلسہ میں پیری یار نے رسول خداؐ کی پاک سیرت اور آپؐ کی صفات پر تفصیلی روشنی ڈالی، حضورؐ کی زبردست تعریف اور توصیف بیان کی۔ ان کے اخبار میں یہ پوری تقریر شائع ہوئی۔ اس تقریر میں توحید اور شرک کا بیان بھی ہے، انسانی مساوات کا بھی تذکرہ ہے۔ اس کے آخر میں کہتے ہیں: ''آپؐ نے یہ بھی کہا کہ میں آخری نبی ہوں، میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔ لوگ کچھ بھی سمجھیں، آپؐ کے بعد آج تک کوئی نبی نہیں آیا۔ آپؐ کی تعلیمات بڑی اہم ہیں۔ اتنے عظیم نظریات آپؐ کے بعد آج تک کسی نے نہیں پیش کیے۔ آپؐ نے سماج کے ہر شعبۂ حیات کے لیے بہت اہم اصول بنائے۔ معاشی میدان میں آپؐ کے دیے ہوئے اصول عقل کو حیران کر دینے والے ہیں۔ ان پر مجھے پورا طمینان قلب حاصل ہے۔''

پیری یار روس اور یوروپی ممالک کے دورے پر گئے۔ وہ کچھ کمیونسٹ ممالک کی ترقی سے متاثر بھی ہوئے۔ تمل ناڈو میں 1916 میں غیر براہمن ذاتوں نے مل کر جسٹس پارٹی قائم کی۔ 1938 میں اتفاق رائے سے پری یار اس کے صدر منتخب کیے گئے۔ بعد میں اس پارٹی کا نام بدل کر دراوڈ کازگام نی رکھا گیا۔ پھر ان کے ایک شاگرد انادورائی نے ڈی یم کے، نام سے الگ سیاسی پارٹی بنائی۔ پیر پری یار نے بعض اہم کتب بھی لکھیں۔ 24 دسمبر 1973 کو ان کا انتقال ہوا۔

(پیریار۔نئی جہتوں کا نقیب۔اشاعت مئی 2013، ناشر :Mulnivasi Publication Trust،Sawe No 5,4/311 Keshavanagar PUNE.411036(Maharashtra))

☆☆☆

کانشی رام

(1934-2006)

کانشی رام کا مشن وہی تھا جس کے لیے جیوتی باپھلے، بابا صاحب امبیڈکر، شاہو مہاراج اور پری یار جیسی ہستیوں نے اپنی زندگیاں وقف کردی تھیں۔کانشی رام نے حالات کے لحاظ سے اپنی حکمت عملی ترتیب دے کر جدو جہد کی۔

کانشی رام کی پیدائش پنجاب کے ایک گاؤں پیرتی پور بنگا Pirthipur Bunga خواص پور، روپڑ ضلع میں 15 مارچ 1934 میں ہوئی ۔ ان کا خاندان چمار سماج سے تعلق رکھتا تھا،لیکن یہ خاندان سکھوں کے خالصہ پنت کو اختیار کر کے سکھ ہو گیا تھا۔ان کے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔5 سال کی عمر میں ان کا داخلہ اسکول میں کیا گیا۔اس زمانے میں دلت طلبہ اور طالبات کو تعلیمی اداروں میں اونچی ذات کے اساتذہ اور دیگر طلبہ کے ہاتھوں کافی ذلت اور حقارت سہنا پڑتی تھی۔انہیں کلاس میں الگ جگہ بٹھایا جاتا اور ان کے لیے پانی کا الگ انتظام کیا جاتا تھا۔ کانشی رام کے افرادِ خاندان کے ساتھ بھی Untouchables کا سا برتاؤ ہوتا تھا۔ وہ نسلی امتیاز اور عدم مساوات کا دور تھا۔ کانشی رام ذہین اور محنتی طالب علم تھے۔ وہ چھٹیوں میں چھوٹے موٹے کاروبار کر کے آمدنی کر لیتے اور اپنے والد پر اخراجات کا بوجھ نہیں ڈالتے تھے۔ وہ مضبوط جسم، پختہ قوت ارادی اور عزم و حوصلے کے مالک تھے۔ انھوں نے 1956 میں B.Sc تک تعلیم مکمل کی۔ اس کے بعد

اعلیٰ تعلیم کے لیے دہرہ دون کے ایک کالج میں داخلہ لیا۔ اس دوران یونین پبلک سروس کمیشن (UPSC) امتحان کی تیاری کرتے رہے۔ اسی زمانے میں انہیں چھوت چھات اور ذات پات کے استحصالی نظام کا شکار ہونا پڑا۔ چند واقعات بھی پیش آئے، جن سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ ایک دفعہ ان کے والد گیسٹ ہاؤس میں تھے۔ ان سے ملنے گئے۔ وہ ایک آفیسر کے آرام کے لیے ہاتھ سے رسی ہلا رہے تھے، تاکہ پنکھا کی ٹھنڈی ہوا سے انہیں راحت ملے وہاں بجلی کا پنکھا نہیں تھا۔ ان کے والد پسینے میں شرابور تھے۔ ان کی حالت دیکھ کر کانشی رام کو بہت دکھ ہوا۔ انہوں نے سوچا کہ والد تبدیلیٔ مذہب کی وجہ سے نچلی کاسٹ کے نہیں ہیں، تب بھی ان کے ساتھ یہ سلوک ہو رہا ہے۔ واقعی جو لوگ محروم اور پس ماندہ ذاتوں کے ہیں، ان کی حالت کتنی خراب ہوگی؟ اسی طرح پونہ میں اپنے طویل قیام کے دوران انہوں نے محروم اور پس ماندہ ذاتوں کے ساتھ اونچی ذات والوں کے امتیازی سلوک کو دیکھا۔ کئی واقعات ایسے پیش آئے، جن سے ان کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ ایک دفعہ پونہ میں سنیئر آفیسروں نے بدھ جینتی اور امبیڈکر جینتی کی تعطیلات کو منسوخ کر کے بال گنگا دھر تلک اور گوپال کرشن گوکھلے کی جینتی منانے کا فیصلہ کیا۔ دلت ملازمین کو بہت صدمہ ہوا۔ انہوں نے احتجاج کیا۔ ایک دلت کی ملازمت ختم کر دی گئی۔ اس نے عدالت سے رجوع کیا۔ کانشی رام نے اس کی بھرپور مدد کی اور کئی اقدامات مسلسل کیے۔ دیگر دلت ملازمین ڈر اور ملازمت کے چھن جانے کے خوف سے خاموش ہو گئے تھے۔ بڑی مشکلوں سے اس شخص کی ملازمت بحال ہوئی۔ تعطیلات کی منسوخی کا فیصلہ کیا گیا۔ لیکن اس واقعہ نے کانشی رام کی آنکھیں کھول دیں۔ تمام دلت ملازمین اس پورے معاملے میں کانشی رام کے رول سے بے حد متاثر ہوئے اور ان کو اپنا ہیرو بنا لیا۔

کانشی رام نے ڈاکٹر امبیڈکر اور شاہو مہاراج کی زندگیوں کا مطالعہ کیا۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی ری پبلکن پارٹی آف انڈیا کے کچھ عرصہ ممبر رہے۔ مہاراشٹر کے مختلف شہروں کا سفر کیا۔ انہوں نے محسوس کیا کہ دلتوں میں تعلیم یافتہ افراد کا ایک مخصوص طبقہ کچھ فائدے اٹھا کر عیش میں ہے، لیکن عام محروم اور پس ماندہ ذاتوں کے افراد بہت مصیبتیں

جھیل رہے ہیں۔ قدم قدم پر چھوت چھات اور ذات پات کی تفریق اور غیر انسانی سلوک کی وجہ سے ان کی زندگیاں جہنم بنی ہوئی ہیں۔ انہوں نے اس کا حل سوچا کہ ایک مضبوط سماج بنا کر حکومت اور انتظامیہ میں اپنا حصہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے ایک تنظیم بنانے کا فیصلہ کیا۔ پونہ میں انہوں نے 1978 میں تعلیم یافتہ دلت ملازمین کی تنظیم بام سیف Backward & Minority Communities Employees Federation(BAMCEF) بنائی۔

اس تنظیم کے ذریعہ جدو جہد کرتے ہوئے وہ محروم اور پس ماندہ ذاتوں کو غلامی اور ذلت کی زندگی سے نکال کر عزت و کام یابی کی شاہراہ پر لے جانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے انہوں نے بہترین ملازمت ترک کر دی اور گھر اور خاندان سے عملاً بے تعلق ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے طے کر لیا کہ کبھی شادی نہیں کریں گے، گھر نہیں بنائیں گے، سماجی تقریبات مثلاً شادی، سال گرہ اور موت کے بعد کی رسوم وغیرہ میں شرکت نہیں کریں گے۔ چنانچہ کانشی رام کی ایک بہن اچانک انتقال کر گئیں، لیکن وہ نہیں گئے۔ ان کے والد کی طبیعت بہت نازک ہو گئی تھی۔ وہ بستر مرگ پر تھے۔ ان کو اطلاع دی گئی، لیکن نہیں گئے۔ والد کا انتقال ہو گیا۔ یہ بڑے بیٹے تھے، لیکن باپ کی آخری رسوم ادا کرنے کے لیے بھی نہیں گئے۔ محروم اور پس ماندہ ذاتوں کے افراد کو اپنا خاندان سمجھا۔

بام سیف نے ڈاکٹر امبیڈکر کے اس نعرہ کو اختیار کیا کہ تعلیم حاصل کیجئے، متحد ہو جائیے اور سنگھرش (جدو جہد) کیجئے Educate, Consolidate & Struggle کانشی رام نے تنظیم کے تعارف اور دلتوں، اقلیتوں اور پس ماندہ ذاتوں کے افراد کو جوڑنے کے لیے سخت محنت کی۔ وہ ایک لیڈر تو تھے ہی، لیکن بہترین کارکن (Activist) بھی تھے۔ ضرورت پڑنے پر تنظیم کی چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے کبھی پیچھے نہیں ہٹتے تھے۔ ایک ایک شہر اور ایک ایک گورنمنٹ آفس میں انہوں نے محروم اور پس ماندہ ذاتوں کے ملازمین سے ملاقاتیں کر کے تنظیم سے ان کو جوڑا۔ اپنی جدو جہد کی نوعیت انہوں نے یہ بتائی کہ وہ Non Political,Non Agitational,Non Religious ہوگی۔ قومی سطح پر بام سیف کو مستحکم کرنے کے لیے وہ دہلی منتقل ہو گئے اور وہاں بام سیف کا دفتر قائم کیا۔ اب کانشی رام

نے پورے ملک کے اہم شہروں کا دورہ کیا اور مسلسل کام کیا۔ وہ کہتے تھے کہ کام اتنا زیادہ ہے کہ مجھے بیمار پڑنے کی بھی فرصت نہیں ہے۔ ان کی محنت رنگ لائی۔ پندرہ برسوں کی کوششوں کے نتیجے میں بام سیف کے ممبروں کی تعداد 2 لاکھ ہوگئی۔ اس میں 500 پی ایچ ڈی اسکالرس، 3 ہزار ڈاکٹرس، 15 ہزار سائنٹسٹ اور 70 ہزار آفس اسٹاف شامل تھے۔ انہوں نے ایک ذیلی تنظیم دلت سوشت سماج سنگھرش سمیتی DS4 قائم کی، جس کے کئی شعبے تھے۔ ان میں سے ایک 'جاگرتی نی تھا۔ ان کا ایک نعرہ یہ تھا: 'تلک ترازو اور تلوار' جوتے ماروان کو چار نی۔ 84-1983 میں پورے ملک میں سائیکل ریلیاں نکالی گئیں اور 15 مارچ 1984 کو بوٹ کلب گراونڈ دہلی میں تین لاکھ کارکن جمع ہوئے، جو نعرے لگا رہے تھے: ''جس کی جتنی سنکھیا بھاری اس کی اتنی حصہ داری'' ''اب بہوجن کی باری ہے اکیسویں صدی ہماری ہے۔'' اس زبردست ریلی کا اختتام لال قلعہ پر ہوا۔ بام سیف کے ممبران سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لے سکتے تھے، اس لیے 1984 میں انہوں نے بہوجن سماج پارٹی بنائی۔ کانشی رام کا یہ بھی خیال تھا کہ قومی سیاسی پارٹیوں کی قیادت اونچی ذات والوں کے ہاتھ میں ہے، جو دلت اور پس ماندہ ذاتوں کے افراد ان پارٹیوں میں اونچے منصب پر ہیں وہ پارٹی کے وفادار بن کر رہتے ہیں۔

کانشی رام کی ملاقات مایاوتی سے ہوئی۔ اس وقت وہ قانون کی سال اول کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور ایک گورنمنٹ اسکول میں ٹیچر تھیں۔ کانشی رام نے ان کی صلاحیتوں اور لیڈر شپ کی قابلیت کا اندازہ کر کے ان پر اعتماد کیا اور وہ بام سیف اور BSP کی ممبر بنیں۔ چنانچہ آئندہ چل کر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ یوپی کی چار مرتبہ چیف منسٹر بنیں۔ عملی سیاست میں کانشی رام کو بی جے پی سے چار مرتبہ Alliance کرنا پڑا۔ باباصاحب امبیڈکر کے بدھ مذہب قبول کرنے کی 50ویں سالگرہ کے موقع پر انھوں نے 30 مارچ 2002 ناگ پور میں 2 کروڑ چمار سماج کے افراد کے ساتھ بدھ مذہب قبول کرنے کا اعلان کیا، لیکن اپنی وفات تک اس پر عمل نہیں کر سکے۔

کانشی رام نے بعض دلت لیڈروں، مثلاً جگ جیون رام اور رام ولاس پاسوان

پر زبردست تنقیدیں کیں کہ یہ پس ماندہ اور محروم طبقوں کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہیں۔

منڈل کمیشن کی سفارشات کو جب وی پی سنگھ نے نافذ کرنے کا اعلان کیا تو مختلف شہروں میں زبردست احتجاج کیا گیا۔اس موقع پر BSP نے نعرہ بلند کیا کہ منڈل کمیشن کی سفارشات کو نافذ کرو، ورنہ سیٹ چھوڑ دو۔

یوپی میں 97-1999 سیاسی اتھل پتھل کا دور رہا۔اس دوران پارٹی کے اندر کافی اختلافات اور تنازعات ابھر کر سامنے آئے۔اس پر کانشی رام بہت دل برداشتہ ہوئے۔۱۹۹۹ میں اپنی سخت بیماری کے بعد ۲۰۰۱ میں مایاوتی کو پارٹی کا جانشین نامزد کیا۔اس کے بعد ان کی طبیعت خراب ہوتی گئی، بالآخر ۲۰۰۶ میں مایاوتی کی رہائش گاہ پر دہلی میں انتقال ہو گیا۔

مایاوتی کے چار مرتبہ چیف منسٹر بننے سے دلتوں اور پس ماندہ ذاتوں کے افراد کو کچھ فائدہ اور مراعات تو حاصل ہوئیں، لیکن ان طبقات کے بنیادی مسائل کا کوئی حل نہیں نکلا۔ ان طبقات پر پہلے کی طرح مظالم ڈھائے جاتے رہے اور ان کا استحصال ہوتا رہا۔

حوالہ: یہ مواد بدری نارائن کی کتاب ”Kanshi Ram Leader of the Dalits“ سے لیا گیا ہے۔

☆☆☆

عملی پروگرام

لمحۂ فکریہ

پچھلے صفحات میں تفصیلی طور پر محروم اور دیگر مظلوم آبادیوں کے حالات اور مسائل پر گفتگو کی گئی ہے ۔ یہ بات بھی واضح کی جا چکی ہے کہ ان آبادیوں کا اصل اور بنیادی مسئلہ محض دستور ہند میں دی گئی ضمانتوں اور قانون سازی کے ذریعہ حل نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح ان کے اندر تعلیم عام کرنے، ریزرویشن ،مرکزی اور ریاستی حکومتوں سے مراعات اور سیاسی اقتدار کے حصول وغیرہ سے بھی یہ مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔ صرف اسلام ہی ان کا اصل اور بنیادی مسئلہ حل کرتا ہے ۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی تعلیمات کی بنیاد پر ہی اپنی عظیم پیغمبرانہ قیادت کے ذریعہ عملاً ایک عالم گیر اور آفاقی انسانی برادری قائم فرمائی ۔ تاریخ میں اس کا ریکارڈ موجود ہے ۔ ایک ایسا معاشرہ اور برادری، جس کی بنیاد رنگ ونسل، زبان وعلاقہ اور برادری نہیں، بلکہ ایک سچا عقیدہ تھا۔ اسلام نے انسانیت کو سماجی مساوات کے ساتھ معاشی اور قانونی مساوات بھی عطا کی ہے ۔ ایک بار کا واقعہ ہے کہ ایک معزز قبیلے کی ایک خاتون نے چوری کی ۔ جرم ثابت ہوا، چنانچہ ہاتھ کاٹنے کی سزا کا فیصلہ ہوا۔ قبیلے والوں نے سوچا کہ اس سے ان کی بڑی بدنامی ہوگی، اس لیے ہاتھ کاٹنے کے بجائے ہلکی سزا دی جائے ۔ چنانچہ حضرت اسامہ بن زیدؓ کو اس کی سفارش کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بھیجا گیا۔ انھوں نے سفارش کی تو آپ ؐ کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ آپ ؐ نے

فرمایا کہ ”تم سے پہلے کی قومیں اسی وجہ سے ہلاک کردی گئیں کہ ان کے بڑے جرم کرتے تو ہلکی سزا دی جاتی اور کمزور وادنیٰ لوگ اسی جرم پر سخت سزا پاتے۔ اللہ کی قسم، محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔(بخاری)

غرض یہ کہ محروم اور دیگر مظلوم طبقات میں حقیقی انسانی مساوات کے حصول، سماجی انصاف، انسانی عظمت اور تکریم کی بحالی، عزت نفس اور خودی کے لیے اسلام کا تعارف کراتے ہوئے اس کی قدروں کو عملاً برت کر اسلامی تعلیمات کے بہترین اور پرکشش نمونے قائم کرنا چاہیے۔

ان حقائق کے پیش نظر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ محروم اور مظلوم طبقات کے قائدین یا ان کی تنظیموں کے ایجنڈے یا دوسرے کسی کے ایجنڈے کے ذریعہ ان کے بنیادی مسئلہ کا حل کیسے نکل آئے گا؟ اب تک اس سلسلے کی کوششوں کا حاصل کیا نکلا ہے اور آئندہ کیا ہوسکتا ہے؟

واقعہ یہی ہے کہ ہماری جانب سے آج تک خصوصی توجہ کے ساتھ ان دلت اور مظلوم طبقات میں منظم سطح پر کام نہیں ہوا ہے۔ اس طبقہ میں نام نہاد اعلیٰ یا اونچی ذاتوں کے خلاف شدید نفرت اور انتقام کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ ان کی لیڈرشپ نے عوام الناس کا مخصوص ذہن بنا رکھا ہے کہ مسائل کے حل کے لیے مذہب کی ضرورت قطعی نہیں ہے۔ ماضی میں ان کا جس مذہب سے بہ ظاہر تعلق تھا، اس کے تصورِ خدا سے انہیں نفرت ہے۔ کیونکہ اس نے انہیں اپنے پیروں سے پیدا کیا ہے۔ ان کے ذمے اپنے سے اوپر خود ساختہ اونچی ذاتوں کی صرف خدمت کرنا ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ خدا اور مذہب کا کوئی دوسرا تصور بھی ہوسکتا ہے۔ اس لیے وہ اپنی جدوجہد کو مذہب سے آزاد رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کی دیگر اقلیتوں کو بھی دعوت یہی ہے کہ مذہب کو ذاتی زندگی کے ایک محدود گوشے میں رکھیں اصلاً ان کی کوشش حصولِ اقتدار کے لیے ہونی چاہیے۔ وہ ہمارا سرگرم تعاون چاہتے ہیں ان کے نزدیک اس ایجنڈے میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ ہمارے مسائل اور مظلومیت کا حل موجود ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مظلومیت اور حقوق سے محرومی دونوں کے درمیان قدر مشترک

ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے قدرتی حلیف ہیں اس لیے ان کے لیے مل جل کر اسی ایجنڈے پر کام کرنا ناگزیر ہے۔ ان کی پوری جدوجہد میں آخرت کی زندگی میں جہنم کے عذاب سے بچنے کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ یہ بات کہ ہمارے اوران کے بعض مسائل یکساں ہیں، درست ہے،لیکن اس مسئلہ کے حل کے لیےان کے ایجنڈے سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا ہے۔ محروم اور مظلوم طبقات میں سے ایک مختصر تعداد نے بودھ مذہب قبول کرلیا ہے۔ بابا صاحب ڈاکٹر امبیڈکر نے بودھ مت قبول کیا تھا۔لیکن اس کے بعد وہ دو تین ماہ میں پراسرار حالت میں وفات پاگئے اس لیے مطلوبہ مقاصد کے حصول میں ان کے تبدیلیٔ مذہب کے اس قدم سے کتنی کام یابی ملی یا ناکامی ہوئی، یہ دیکھنے کے لیے وہ زندہ نہیں رہے۔

اقدام کی ضرورت

ایک بار ہمارا قلب وذہن ان محروم اور مظلوم طبقات میں کام کے لیے یکسو ہوجائے تو اگلا مرحلہ عملی اقدام کا ہے۔ ہم نے قریب کی صدیوں میں اس اہم کام سے مسلسل غفلت برتی۔ اس سے صرف وہ کوششیں مستثنیٰ ہیں جو اولیائے کرام اور اسلاف نے کی تھیں۔

روایات کے مطابق ہمارے ملک میں صحابہ کرامؓ اور تابعین عظامؒ کی تشریف آوری ہوئی۔ صحابہ کرامؓ، تابعین عظامؒ اور اولیائے کرامؒ نے ماضی میں شودر کہلائے جانے والے طبقات میں اسلام کی دعوت کو پیش فرمایا۔ ان کے ساتھ حسن سلوک اور حسن اخلاق سے پیش آئے۔ ان کو حقیر اور ذلیل نہیں سمجھا۔ اللہ کے بندے اور اپنے بھائی سمجھ کر ان کی مظلومیت اور دردناک حال کو دور کرنے اور اخروی زندگی میں عذاب جہنم سے بچانے کے لیے انھیں گلے لگایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی کوششوں کو شرف قبولیت بخشا۔ پورے ملک میں جگہ جگہ ان آبادیوں نے اسلام قبول کیا۔ قبول اسلام کے بعد ان کی زندگیوں میں انقلابِ عظیم آگیا۔ ان کی سماجی حیثیت اور رتبہ بلند ہوگیا۔ کوئی ان کو شودر کہہ کر اونچ نیچ اور چھوت چھات کے ناروا امتیازات نہیں برت سکتا تھا۔ انہیں پیدائشی مسلمانوں کے برابر حقوق اور درجے مل گئے، دیگر مسلمانوں کی طرح عزت اور برابری حاصل ہوئی۔

آج ضرورت ہے کہ پھر سے اسلاف کے نقش قدم پر چل کر ہم ان طبقات کے اندر کام کریں۔ کیوں کہ اس سے غفلت برت کر ہم اس کے سنگین نتائج کو بھگت رہے ہیں۔ اس فریضے کی ادائیگی کے لیے مسلمانوں کی بڑے پیمانے پر ذہن سازی کی ضرورت ہے۔ ان کے اندر اس فریضے اور اس کو کما حقہ ادا کرنے کی اہمیت اور ضرورت اور فائدوں کو سمجھانا چاہیے۔ ہمارے نوجوان اور تعلیم یافتہ افراد وفود بنا کر ان کے محلوں اور بستیوں میں جائیں۔ ان سے ملاقاتیں، بات چیت کرنے اور ان کے ساتھ کھانے پینے کے پروگرام بنائیں۔ اس کے علاوہ بھی روزمرہ کی زندگی میں اسلامی اخلاق و کردار اور حسن سلوک کے عملی نمونے پیش کریں۔ اس کے نتیجے میں ان کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ایک مثبت رائے قائم ہوگی۔ موجودہ نازک اور مشکل حالات میں بعض چالاک لوگوں کی بھرپور کوشش ہے کہ ان کے اندر مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرکے دونوں کو آپس میں لڑا دیں۔ چند مقامات پر ایسے شر پسندوں کو کامیابی بھی ملی ہے۔ محروم، مظلوم طبقات اور مسلمانوں کا آپس میں لڑنا جھگڑنا۔ ان دونوں کے مفاد میں ہے نہ ملک کے مفاد میں۔ اس میں دونوں فرقوں کا نہ صرف جان و مال کا نقصان ہوتا ہے، بلکہ سب سے بڑا نقصان آپس کی دوری، نفرت اور دشمنی کے جذبات کا پیدا ہونا ہے۔

● دلت تحریکات اور تنظیموں کے کیڈر اور مسلمانوں کے درمیان اچھی تفہیم، تعلیم اور جذبۂ عمل کی بیداری کا کام کرنا ہوگا۔

● میدان عمل میں مہمات کا اہتمام ضروری ہے، جس کے ذریعے عوامی بیداری اور ماحول کی تیاری اور عوامی لہر برپا کرنی ہوگی۔

● بعض موضوعات کو اس طرح عوامی مسئلہ بنانا ہوگا کہ میڈیا اور علمی و عوامی حلقوں میں وہ بحث کا موضوع بن جائے۔ اور حکومتی اور عوامی نمائندوں کو ان کے حل پر مجبور ہونا پڑے۔

● فلاحی اداروں کا قیام اور بہت سے معاملات کو ہاتھ میں لے کر عوامی خدمات کے ذریعہ ان کی تکمیل کی کوشش کرنی ہوگی اور حکومتی اداروں کو ان پر کام کرنے اور حکومتی فنڈ کے خرچ کرنے پر آمادہ کرنا ہوگا، وغیرہ

● سماجی مسائل کے حل کے سلسلے میں منفرد کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی، تاکہ دیگر مقامات پر کام کرنے والوں کو ترغیب ملے۔

● سوشل میڈیا نیٹ ورکنگ سے بھی استفادہ کرنا ہوگا۔

● محروم اور مظلوم بھائیوں کے منتخب محلوں اور بستیوں میں خدمت خلق کے ضمن میں درج ذیل کام کیے جائیں:

۱ــ غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کا انتخاب کیا جائے اور ذی حیثیت لوگوں سے اسپانسر کر کے ان کی مدد کی جائے۔

۲ــ بلالحاظ مذہب وملت غیر تعلیم یافتہ عمر رسیدہ لوگوں کے لیے تعلیم بالغان کے حلقے چلائے جائیں۔

۳ــ پرائمری تعلیم کے معیار کا مسئلہ نظام تعلیم کے متاثر ہونے کی ایک اہم وجہ ہے۔ پس ماندہ بستیوں میں یہ اور زیادہ متاثر ہے، اس کی درستگی کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ مندرجہ بالا تعلیمی مقاصد کے لیے ریٹائرڈ ٹیچرس کی خصوصی خدمات لی جاسکتی ہیں۔

۴ــ صحت، صفائی کی بنیادی معلومات فراہم کرنے کے لیے کسی ڈاکٹر کا لیکچر ان کے محلوں اور بستیوں میں رکھا جاسکتا ہے۔

۵ــ ان کی خواتین کے پروگرام بھی رکھے جاسکتے ہیں۔

۶ــ تعلیم، صحت، اور اخلاقی و دینی تربیت کے لیے منتخب محلوں اور بستیوں میں کام کیا جائے۔

ان طبقات میں مستقل کام کے ساتھ عارضی اور ہنگامی مواقع سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ مثلاً سفر کے موقع پر تھوڑی دیر کا ساتھ ہو جاتا ہے اسی طرح اسپتال میں یا اسکول اور بس اڈے یا ریلوے اسٹیشن پر ٹرین کے انتظار کے مواقع پر۔

گفتگو کے نکات

(۱) گفتگو سے پہلے اللہ تعالی سے نصرت اور تائید کی دعا کرنی چاہیے۔

(۲) پہلے اپنا نام، مقام اور تعارف پیش کرنا چاہیے۔ اسی طرح ان کا نام، مقام،

پروفیشن کے ساتھ تعارف حاصل کرنا چاہیے۔ایک دوسرے کے گھروں کے احوال بھی مثلاً بچے کتنے ہیں کیا کرتے ہیں معلوم کرنا چاہیے۔اس سلسلے میں دو باتیں پیش نظر رکھیں: اس ابتدائی تعارف کے بعد تعلق پیدا کرنا آسان ہوتا ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ پہلی ملاقات میں ابتدائی تعارف اور شناسائی کے بغیر محض اسلام کی بات کہہ دینے میں جھجھک ہوتی ہے۔جب کہ تعلق پیدا ہونے کے بعد گفتگو کرنا فطری معلوم ہوتا ہے۔

یہ بات بہت اہم ہے کہ محروم اور مظلوم طبقات کے افراد، ہماری جانب سے دوستی اور تعلق کے لیے تعارف حاصل کرنے کو پسند کرتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم ان سے محبت کرتے ہیں، ملاقات اور بات چیت کرتے ہیں۔

(۳) ان کے متعلق بلاوجہ کوئی منفی رائے قائم نہیں کرنا چاہیے اور نہ کسی طرح کی بدگمانی کو جگہ دینی چاہیے۔

(۴) یہ رائے قائم نہ کریں کہ وہ آپ کے ساتھ بات چیت پسند نہیں کریں گے، یا آپ کی بات چیت سے وہ ناراض ہوں گے، یا کسی منفی ردعمل کا اظہار کریں گے۔تجربات بتاتے ہیں کہ وہ آپ کی جانب سے احترام اور دوستی کو پسند کرتے ہیں۔

(۵) ہمیشہ ان کی پوری بات سننا چاہیے۔درمیان میں ان کی بات نہ کاٹیں بے صبری کے ساتھ اپنی بات نہ پیش کریں، بلکہ صبر کے ساتھ ان کی باتوں کو سنیں، اس کے بعد اپنی بات پیش کریں۔غیر متعلق اور طویل گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔

(۶) کسی بات پر اختلاف رائے ہوجائے تو لہجے میں شدت اختیار نہ کریں۔ مخالف رائے کو سننا دعوت کے مفاد میں ہوگا دو ایک ملاقاتوں میں کسی کو پوری طرح ہم خیال اور ہم نوا نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ اس میں وقت لگ سکتا ہے۔دعوت کا کام کرنے والوں کو جلد بازی اور عجلت میں قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔

(۷) ان طبقات کے اندر درج ذیل گروپس تک ملاقاتیں کر کے ترجمہ قرآن، بنیادی دعوتی کتابیں اور سیرت رسولؐ پر کوئی کتاب، سیٹ بنا کر پہنچانا چاہیے۔اس یقین کے ساتھ کام کریں کہ لوگ منتظر ہیں۔چاہتے ہیں کہ انہیں کوئی اس طرح کی کتب اور

ترجمہ قرآن فراہم کرے۔ گروپس کی تفصیل درج ذیل ہے:

i— مذہبی رہ نما

ii— وکلا اور ججز

iii— ادیب، شاعر اور نقاد

iv— ٹیچرس، پروفیسرس

v— صحافی (پرنٹ اور الیکٹرانک)

vi— انتظامیہ کے ذمہ دار

vii— سیاسی وغیر سیاسی تنظیموں، اداروں اور جماعتوں کے قائدین۔

ان نکات کو ذہن میں رکھ کر ابتدائی تعارف کے بعد آپ بات چیت کیسے کریں؟ اس کے لیے کوئی لگا بندھا ضابطہ نہیں ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ پہلے سے کچھ لوگ آپس میں گفتگو کررہے ہوں، گفتگو کا موضوع حالات حاضرہ ہوسکتا ہے۔ مثلاً سماجی بگاڑ، کرپشن، اخلاقی برائیاں یا خواتین کے خلاف بڑھتے جرائم اور ان کی روک تھام۔ ایسی صورت میں آپ اجازت لے کر گفتگو میں شریک ہوں اور اس کا حقیقی حل پیش کریں، یعنی اللہ پر ایمان، آخرت کی باز پرس اور جہنم کے عذاب کا خوف۔ انھیں بتائیں کہ اللہ اور آخرت پر ایمان ویقین کے نتیجے میں کس طرح کا کردار وجود میں آتا ہے اور کیسی سیرت بنتی ہے۔ ایمان ویقین کے بغیر محض نئے اور پرانے قوانین کے نفاذ، جیل اور عدالت کے نظام اور تعلیم کے فروغ یا معاشی ترقی کے ذریعہ بگاڑ دور ہونے کا امکان نہیں، اگرچہ معاشرہ میں ان سب کی ضرورت مسلّمہ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ لوگ کسی خاص واقعہ یا حادثہ پر گفتگو کررہے ہوں۔ آپ یہاں بھی شریک گفتگو ہوکر اپنی بات کو رکھ سکتے ہیں۔ اگر یہ صورتیں درپیش نہ ہوں تو آپ ان لوگوں کے سامنے خود کوئی سوال رکھ کر آغاز کرسکتے ہیں۔ یعنی خدا اور مذہب کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے؟ زندگی بعد موت کے بارے میں وہ کیا تصور رکھتے ہیں؟ اس طرح زندگی کے مقصد کے بارے میں کیا انہوں نے کبھی سوچا ہے؟ آپ کو اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ اس

طرح کے سوالات سے وہ ناراض نہیں ہوتے۔ سننے اور گفتگو کرنے میں دل چسپی لیتے ہیں۔گفتگو کے بعد انھیں دینے کے لیے فولڈرس اور کتابیں آپ کے پاس ہونی چاہییں۔گفتگو کے اختتام پر ان کا موبائیل نمبر اور میل ایڈرس وغیرہ نوٹ کر لینا چاہیے۔اپنا نمبر بھی انھیں نوٹ کرادیں، تاکہ آئندہ ربط رکھنے میں دشواری نہ ہو۔اس دور میں انٹرنیٹ اور موبائیل فون کی وجہ سے ربط رکھنے میں بڑی سہولت ہوگئی ہے۔

ان افراد سے ایک بار تعارف اور ربط قائم ہونے کے بعد اسے درمیان میں ادھورا نہیں چھوڑنا چاہیے، بلکہ ایک نتیجہ تک پہنچانا چاہیے، یعنی وہ حق کی تائید اور حمایت کریں۔مسلسل ربط اور ملاقاتوں کے نتیجے میں وہ سمجھ لیں کہ اسلام خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے پسندیدہ اور مکمل ضابطہ حیات یا نظام زندگی ہے۔اس کے علاوہ کوئی اور دین خدا کی طرف سے انسانوں کے لیے نہیں بھیجا گیا ہے۔ اسلام ہر فرد کے لیے موجبِ فلاح ونجات ہے۔ان کے لیے دعا کرتے رہنا چاہیے۔

بعض اوقات الجھن ہوتی ہے کہ ملاقاتوں اور گفتگوؤں میں ہر مرتبہ اسلام پر بات چیت کیسے ہوگی؟ ہر بار اسلام پر صراحت سے گفتگو ضروری نہیں ہے، البتہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے، یہاں تک کہ ہر ملاقات میں آپ کا رویہ، برتاؤ اور اخلاق اسلام کی تعلیمات کا نمونہ ہو۔ ایسی تمام ملاقاتوں میں حضورؐ کی سنتوں پر عمل کریں ان شاء اللہ یہ سب دعوتی کام کا حصہ ہوگا۔ ملاقاتوں میں واضح ہوجائے گا کہ آپ ان کے خیر خواہ ہیں، ان سے محبت اور ہمدردی رکھتے ہیں۔ملاقاتوں میں گفتگو کرتے ہوئے ان کے مسائل میں دل چسپی لیں۔ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں حل سمجھائیں۔ وہ مایوس ہوتے ہیں تو انھیں ڈھارس بندھائیں۔اگر ممکن ہو تو کچھ تعاون یا ان کے کسی مشکل مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کوشش کریں۔ان کے لیے دعا کرتے رہیں۔جب آپ کو اس بات کا یقین ہوجائے کہ وہ اسلام ہی کو حق اور من جانب اللہ سمجھتے ہیں تو انھیں غور اور فیصلہ کرنے کے لیے کہہ سکتے ہیں۔

کام کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان پر ہونے والے مظالم کے ازالے کی کوشش کی جائے۔ اسلام کمزوروں، زیردستوں اور مظلوموں کے حقوق کا زبردست حامی ہے۔ وہ ان پر مظالم کے خلاف آواز اٹھانے کی تعلیم دیتا ہے۔ان کی آبادی یا بستی میں کوئی

حادثہ یا واقعہ پیش آجائے تو ایک وفد بنا کر جانا چاہیے۔ ان کی جس قدر مدد ممکن ہو، کرنی چاہیے۔ اس غم میں برابر کا شریک ہونا چاہیے۔ ظلم وزیادتی سے بچانے کے لیے تدابیر پر غور کرنا چاہیے۔ انہیں قانونی امداد مہیا کرانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ سرکار سے معاوضہ دلانے کی کوشش کی جائے۔ ہنگامی ریلیف کے ذریعہ ان کی پریشانیوں اور مسائل کے حل کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔ اس سلسلے میں بعض کاموں کی انجام دہی کے لیے ادارے قائم کیے جاسکتے ہیں۔

اس ضمن میں عملی پروگرام کا ایک خاکہ بہ طور نمونہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس میں سے جو کام بھی کیے جاسکتے ہیں، اس کے لیے منصوبہ بنا کر کوشش کرنی چاہیے:

ایک خاکہ

اس خاکے میں درج کاموں کی حیثیت خدمت خلق کے کاموں کی ہے۔ انہیں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوش نودی کے جذبے سے انجام دینا چاہیے۔ کام کرنے والوں کا کوئی مفاد ان سے وابستہ نہ ہو، شہرت اور مقبولیت کے جذبات سے ذہن وقلب کو پاک کرنا چاہیے۔

تعلیمی امداد کا اہتمام

۱۔ طلبہ اور طالبات کے لیے کوچنگ سینٹر قائم کرنا یا کوچنگ کا نظم کرنا۔

۲۔ مستحق طلبہ اور طالبات کی فیس، یونی فارم اور اسکالرشپ وغیرہ کا نظم کرنا۔

۳۔ بالغ مردوں اور خواتین کے لیے تعلیم بالغان کا مرکز Adult Education centre قائم کرنا۔

۴۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کی فلاحی اسکیموں کا تعارف کرانا اور ممکنہ تعاون کے ذریعہ اسکیموں سے ان کو فائدہ پہنچانا۔

صحت اور صفائی

۱۔ اسلامی تعلیمات میں صحت کے اصول، پاکی صفائی کی اہمیت اور ضرورت کے موضوعات پر لکچرس کا اہتمام۔

۲۔ فری میڈیکل کیمپ کا نظم کرنا، مفت دوائیاں فراہم کرنا۔

۳۔ جہاں ممکن ہو، ڈسپنسری قائم کرنا اور معمولی فیس لے کر علاج معالجہ کی سہولت بہم پہنچانا۔

۴۔ بڑے اور مہنگے آپریشن کے لیے حکومتی اسکیموں سے انہیں مالی تعاون فراہم کرانا۔

لائبریری کا قیام

ان کے محلے یا بستی میں لائبریری قائم کرنا۔ لائبریری کے ساتھ اخبار ورسائل میں دیگر اسلامی رسائل رکھے جائیں۔ ترجمۂ قرآن مجید، احادیث کے مجموعے، سیرت رسولؐ اور اسلام کے تعارف پر مشتمل کتب کا نظم کرنا۔

دیگر ضروری سرگرمیاں

۱۔ ان کے بی پی ایل کارڈ بنوانے میں رہ نمائی اور مدد کرنا۔

۲۔ ضعیفوں، بیواؤں اور بوڑھوں وغیرہ کے لیے جو وظیفہ سرکار سے دیا جاتا ہے، اس کو دلانے میں ان کی رہ نمائی اور تعاون کرنا۔

۳۔ شراب کی برائی سے چھٹکارا دلانے کے لیے نشہ مکت کیندر میں علاج وغیرہ کے ساتھ پروگرام منعقد کرنا۔ اس کے لیے ذہن سازی کرنا۔

۴۔ ان کے گاؤں کے سرپنچ کے نام ہندی ماہ نامہ کا نتی جاری کرنا۔

ہر سال درج ذیل پروگرام ان کے محلے یا بستی میں منعقد کرنا چاہیے:

عید ملن کی مجالس

عید الفطر کے بعد انہی کے محلے یا بستی میں عید ملن پروگرام منعقد کیا جاسکتا ہے۔ اس میں ان کے منتخب اور بااثر شخصیتوں کو اظہار خیال کا موقع دے کر آخر میں صدارتی تقریر میں رمضان، روزہ، قرآن وغیرہ کے بارے میں بتانا چاہیے۔ فولڈرس اور دعوتی کتب بھی تقسیم کرنا چاہیے۔ منتخب شخصیتوں کو ترجمۂ قرآن مجید دینا چاہیے۔

سیرت رسولؐ کے جلسے:

ربیع الاول کے مہینے میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے حوالے سے ان ہی کے محلے میں یہ پروگرام منعقد کیا جاسکتا ہے۔ان کے منتخب شخصیتوں کومختصراً اظہار خیال کا موقع دیا جائے۔آخر میں صدارتی تقریر کے ذریعہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مبارک اور پاکیزہ زندگی کا تعارف، نیز آپؐ کا پیغام ،دعوت اور تعلیمات کو پیش کیا جائے۔فولڈرس اور اسلام کے تعارف پر مشتمل کتابوں کو تقسیم کرنا چاہیے۔منتخب شخصیتوں کو ترجمہ قرآن مجید دیا جائے۔

☆☆☆

ضمیمہ

پونہ پیکٹ (تاریخی پس منظر)

(25 ستمبر 1932)

دلت تحریکات کی تاریخ میں پونہ معاہدہ ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ محروم اور دیگر پس ماندہ طبقات کے سماجی حقوق کے حصول کی جدوجہد میں اس واقعہ کے نہایت گہرے اثرات پڑے ہیں۔

ڈاکٹر امبیڈکر کی مسلسل کوششوں سے ملک کے دلتوں کی عام ہندوؤں اور اعلیٰ ذات والوں سے الگ شناخت وحیثیت قائم ہونے کے آثار پیدا ہو چکے تھے۔ پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس لندن (ستمبر 1931) کے بعد پہلی مرتبہ دلتوں کو اپنی محفوظ آبادی کے لحاظ سے محفوظ حلقۂ انتخاب رکھنے کی گنجائش اور ووٹ دینے کا حق حاصل ہو رہا تھا۔ اس سے قبل انہیں ووٹ دینے کا حق حاصل نہیں تھا۔ ان کی سیاسی زندگی کسی قسم کے حقوق اور اختیارات سے محروم تھی۔ وہ محض اعلیٰ ذاتوں کے رحم وکرم پر تھے۔ ڈاکٹر امبیڈکر کی دانش وارانہ اور بیدار مغز قیادت نے سیاسی میدان میں ایک بڑی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اگست 1932 میں برطانوی وزیر اعظم سر سیموئیل نے ایک اعلان کیا جس کو کمیونل ایوارڈ کہا جاتا ہے۔ اس کے ذریعہ دلتوں کو محفوظ نشستوں میں ووٹ دینے

کے علاوہ عام انتخابات میں بھی ووٹ دینے کا حق مل رہا تھا۔لیکن گاندھی جی کو یہ منظور نہیں تھا۔انھوں نے ہمیشہ دلتوں کے مسائل کو حل کرنے اور ان کے ساتھ ہمدردانہ رویہ اختیار کرنے کی بات کہی تھی۔انہوں نے دلتوں کو'ہریجن'(خدا کے بندے) کا لقب اپنے رسالے'ہریجن' میں دیا تھا،مگر دلتوں نے اسے قبول نہیں کیا۔گاندھی جی کا خیال تھا کہ کمیونل ایوارڈ کی وجہ سے ہندو سماج ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوسکتا ہے۔اس کی منسوخی ان کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گیا۔انہوں نے اس کے خلاف مرن برت رکھنے کا اعلان کر دیا۔چناں چہ ستمبر 1932 میں ان کے اعلان کے ساتھ ہی پورے ملک میں ڈاکٹر امبیڈکر کی مخالفت شروع ہوگئی۔ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنے موقف کو دلائل کے ساتھ سمجھایا اور گاندھی جی سے اپیل کی کہ وہ مرن برت ختم کریں۔دوسری طرف ڈاکٹر امبیڈکر پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ گاندھی جی سے ملاقات کریں اور کوئی سمجھوتہ کر کے گاندھی جی کی جان بچائیں۔

اگر ایسا نہیں کیا گیا تو پھر گاندھی جی کی موت کی ذمہ داری ڈاکٹر امبیڈکر پر ہوگی۔شروع میں ڈاکٹر امبیڈکر اپنے فیصلے پر اٹل تھے،یعنی وہ گاندھی جی سے ملاقات نہیں کریں گے،لیکن اس بابت جو تجاویز بھی دی جائیں گی ان پر غور کریں گے۔صورت حال سنگین ہونے لگی اور امبیڈکر صاحب کو مصالحت پر آمادگی ظاہر کرنی پڑی۔اسی دوران بعض اہم شخصیتوں نے ڈاکٹر امبیڈکر سے ملاقات کر کے گاندھی جی سے سمجھوتہ کرنے پر اصرار کیا۔گاندھی جی کی حالت دن بدن بہت نازک ہونے لگی۔امبیڈکر نے حالات کی نزاکت کو محسوس کیا اور پونہ جیل میں،جہاں گاندھی جی قید میں تھے،ان سے ملاقات کی اور ایک معاہدہ تیار کرلیا گیا۔گاندھی جی نے اس کو اپنی رضامندی دے دی۔برطانوی حکومت کو اس کی اطلاع دی گئی۔حکومت نے اس کو منظور کرلیا۔27 ستمبر کو گاندھی جی کا مرن برت ختم ہوا۔ (ڈاکٹر بابا صاحب بھیم راؤ امبیڈکر۔حیات اور کارنامے۔ص ۱۶۳ تا ۱۷۰)

☆☆☆

کتابیات

۱	دلت مسئلہ— جڑمیں کون؟	انتظار نعیم	مدھر سندیش سنگم E-20، ابوالفضل انکلیو جامعہ نگر، نئی دہلی110025
۲	ہندوستان میں ذات پات اور مسلمان	ڈاکٹر مسعود عالم فلاحی	القاضی ،F-86/A، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی، ۱۱۰۰۲۵، طبع اول، ۲۰۰۷ء
۳	آریہ سماج کی تاریخ	لالہ لاجپت رائے	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ویسٹ بلاک آر کے پورم نئی دہلی 110066 ایڈیشن 1997
۴	کم زور اور مظلوم اسلام کے سائے میں	مولانا سید جلال الدین عمری	مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز D-307، دعوت نگر، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025 اشاعت 2007
۵	انسانی مساوات وسماجی عدل	مولانا وحید الدین خان	ہفتہ انسانی مساوات وسماجی عدل کے موقع پر شائع کردہ جماعت اسلامی ہند حلقہ کرناٹک وگوا سال اشاعت اپریل 1997

۶	ڈاکٹر امبیڈکر اور اسلام	ڈاکٹر آر ایس عادل	امن پبلکیشن سی۔50 /1 یمناوہار، دہلی 110053۔اشاعت 1995
۷	مہاتما جیوتی باپھلے	سید شاہ غازی الدین	ادارہ برائے مطالعہ وتحقیق تاریخ دکن شولاپور 209 شنی وار پیٹھ۔ شولاپور 413002 مہاراشٹر۔اشاعت 2005
۸	ڈاکٹر باباصاحب امبیڈکر–حیات اور کارنامے	سید شاہ غازی الدین	ادارہ برائے مطالعہ وتحقیق تاریخ دکن شولاپور 209 شنی وار پیٹھ۔شولاپور 413002 مہاراشٹر، تاریخ اشاعت مئی 2007
۹	راج رشی شاہو مہاراج	سید شاہ غازی الدین	ادارہ برائے مطالعہ وتحقیق تاریخ دکن شولاپور 209 شنی وار پیٹھ۔ شولاپور 413002 مہاراشٹر۔ پہلا ایڈیشن 2009
۱۰	پری یار–نئی جہتوں کا نقیب	سید مقصود	مول نواسی پبلکیشن ٹرسٹ، کیشونگر۔ پونے 411036 مہاراشٹر، تاریخ اشاعت مئی 2013
۱۱	دلت دکھ درد اور اسلام		انگریزی ہفتہ وار ’’ریڈینس‘‘، نئی دہلی کی پیش کش، اشاعت اول 2006
۱۲	Kanshi Ram - Leader of the Dalits	Badri Narayan	Penguin India Books Ltd II, Community Centre Panchasheel Park South, New Delhi 110017
۱۳	فرائیڈے اسپیشل	ہفتہ وار میگزین	سید ہاؤس۔آئی آئی چندریگر روڈ کراچی۔ 74200

☆☆☆

اسلام میں بندوں کے حقوق اور خدمتِ خلق پر

ہماری اہم مطبوعات

انسان کے بنیادی حقوق	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کے حقوق	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
اسلام اور عدل اجتماعی	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
دولت میں خدا اور بندوں کا حق	مولانا سید جلال الدین عمری
کمزور اور مظلوم اسلام کے سایے میں	مولانا سید جلال الدین عمری
اسلام اور انسانی حقوق	مولانا سید جلال الدین عمری
اسلام انسانی حقوق کا پاسبان	مولانا سید جلال الدین عمری
انسانوں کی خدمت اسلام کی نظر میں	مولانا سید جلال الدین عمری
اسلام میں خدمت خلق کا تصور	مولانا سید جلال الدین عمری
غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق	مولانا سید جلال الدین عمری
بندوں کے حقوق	مولانا ابو مسعود اظہر ندوی
حقوق العباد	بنت الاسلامؒ
خدمت انسان بندگی رب	خرم مرادؒ
خدمت خلق ایک عملی خاکہ	شعبۂ تنظیم
اسلام میں عدل اجتماعی	سید قطب شہیدؒ
والدین کے حقوق اور صلۂ رحمی	سید لطف اللہ قادری
اسلام اور اجتماعیت	مولانا صدرالدین اصلاحیؒ
اسلام کا تصور حیات اور اجتماعی زندگی کی ذمے داریاں	ڈاکٹر فضل الرحمن فریدیؒ

دعوتی کام کرنے والوں کے لیے

انمول تحفے

دعوت دین کی منصوبہ بندی	ایچ عبدالرقیب
جذبۂ دعوت کی آبیاری	محمد اقبال ملّا
وحدت ادیان کی حقیقت	محمد اقبال ملّا
حق کی تلاش	محمد اقبال ملّا
آدی باسی سماج اور مسلمان	محمد اقبال ملّا
دعوتی کاموں کے لیے خطوط کار	محمد اقبال ملّا
دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک — سیرتؐ کی روشنی میں	عبدالرب کریمی
اسلام: غلط فہمیوں اور اعتراضات کا ازالہ	زین العابدین منصوری
اوتارواد اور رسالت — ایک تقابلی مطالعہ	ڈاکٹر محمد احمد
ہندوستانی مذاہب میں توحید، رسالت اور آخرت کا تصور	مفتی محمد مشتاق تجاروی
داعی اور دعوت	مولانا جلیل احسن ندویؒ
داعی کے اوصاف	بنت الاسلامؒ
دعوت اسلامی اور اس کے اصول و آداب	محمد فاروق خاں
دعوت اسلامی — اصول اور تقاضے	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
دعوت اسلامی اور مسلمانوں کے فرائض	میاں طفیل محمدؒ
دعوت اسلامی اور ہمارا طرز عمل	ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدیؒ
دعوت اسلامی کیا ہے؟	شعبہ تنظیم
دعوت دین اور اس کا طریقِ کار	مولانا امین احسن اصلاحیؒ